آپ بیتی

خواجہ حسن نظامی

نہایت دلچسپ، نہایت عجیب، نہایت مفید،

خود جناب خواجہ صاحب کی لکھی ہوئی

جسکے آخر میں جناب مُلّا محمد الواحدی صاحب ایڈیٹر اخبار خطیب و رسالہ

نظام المشائخ دہلی اور جناب مولوی شیخ احسان الحق صاحب ایڈیٹر رسالہ

اسوۂ حسنہ و رازِ نیاز کے دیباچے شامل ہیں

کارکن حلقۂ المشائخ عرب سرائے دہلی نے

سنہ ۱۳۳۸ ہجری مطابق سنہ ۱۹۱۹ عیسوی

لالہ ٹھاکر داس مینیجر کے اہتمام سے دلی پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپوا کر شائع کی

بار اول — قیمت مجلد [illegible] — غیر مجلد [illegible]

F.P.
H.L. 8067

جناب خاکسار صاحب کی
خدمت میں

یہ آپ بیتی، جناب منشی غلام نظام الدین صاحب تاجر کتب
چاندنی چوک دہلی کی خدمت میں بطور یادگار پیش کی جاتی ہے
جن کو میری آپ بیتی سے ایک عملی رہنما کا تعلق رہا ہے۔

حسن نظامی

ستمبر ۱۹۱۹ء

رین بسیرا۔ دہلی

Lakshmi Art, Byculla, Bombay.
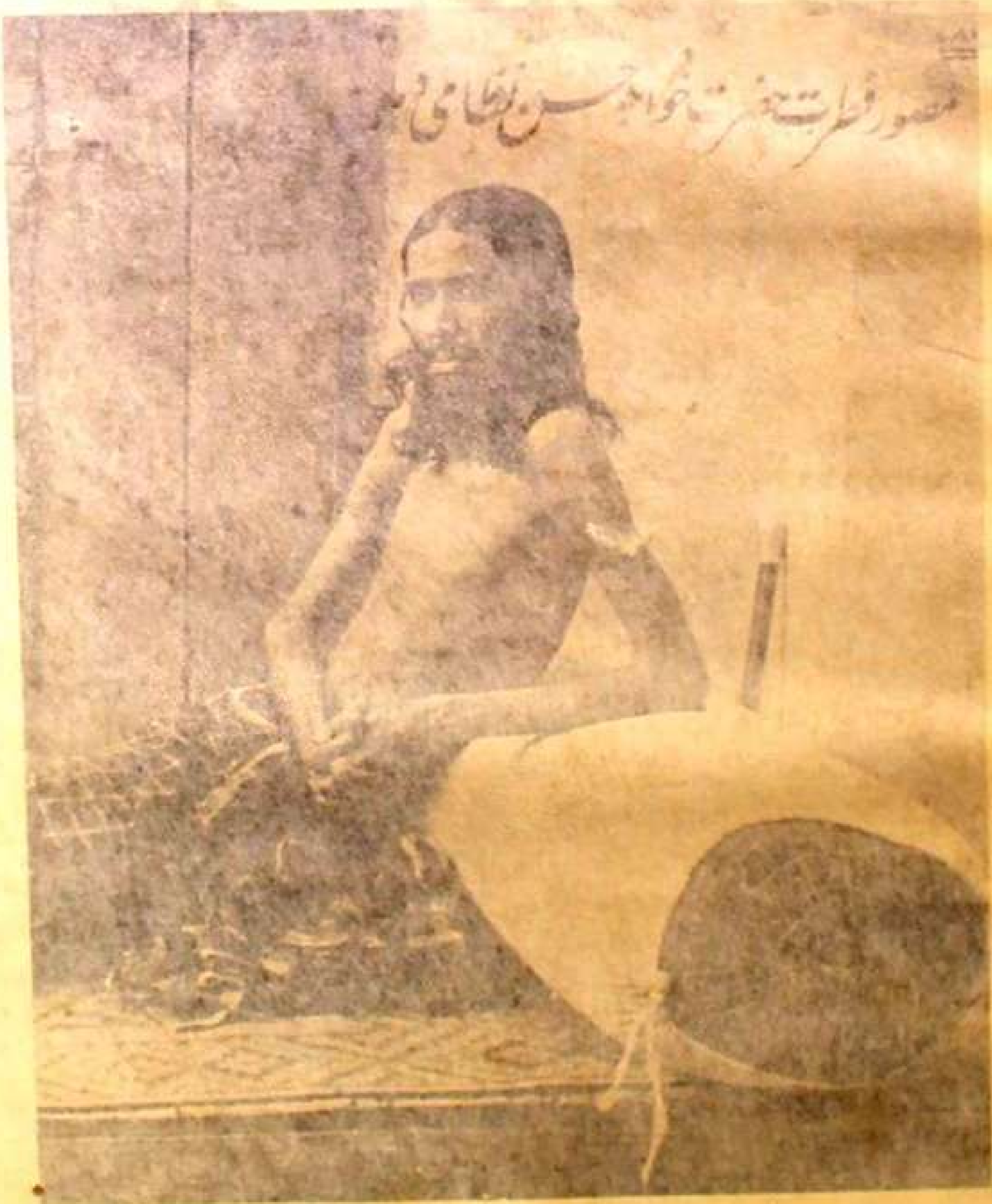
خواجہ حسن نظامی دس برس کے

شروع خدا کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے

دیباچوں کا دیباچہ

اس کتاب پر تین آدمیوں نے دیباچے لکھے ہیں۔ پہلا خواجہ صاحب نے دوسرا چودھری صاحب نے تیسرا بھیا احسان نے۔

بھیا احسان بہت تفصیل سے لکھنے کا قصد رکھتے تھے مگر بیمار ہو گئے اور بحالت بخار یہ مختصر سا دیباچہ لکھ سکے امید کے موافق انہوں نے اس کتاب کے نقائص پر اعتراض کیے ہیں لیکن زیادہ تعجب آیا کہ خود میری ذات پر آزادانہ نکتہ چینی کرتے جس پر وہ پوری طرح آمادہ تھے۔ خدا کو منظور ہے تو کتاب ہذا کے طبع دوم کے وقت میں انکی نکتہ چینی حاصل کر کے شائع کرونگا۔

بھیا احسان نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ایک بات اس قابل ہے کہ میں اسکی تشریح بیان کر دوں ورنہ ناواقف لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے گی۔

اصل قصہ یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے ہر اچھے برے واقعہ کو اس کتاب میں لکھ دینا تھا۔ کتاب کے شروع میں اس کا اشارہ بھی میں نے کیا ہے کہ زندگی کے عیب و صواب سب لکھنے چاہتا ہوں چنانچہ دیباچہ بھی [illegible] سے مخفی بات میں نے باقی نہ رکھی سب قلم بند کر دیا۔ اسکی خبر صوبہ بمبئی کے تعلیم یافتہ مریدوں کو ہو گئی کہ میں اس قسم کی آزادانہ کتاب لکھ رہا ہوں تو انہوں نے شدت سے مخالفت کی۔ اور لکھا کہ بعض امور ایسے ہیں

ان کے اظہار سے نفع نہیں ہوتا۔ بلکہ بندگان خدا کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔

دہلی میں والدی صاحب اور بھیا احسان کی رائے تھی اور خود میں بھی یہی چاہتا تھا کہ خدا کی مخلوق کے سامنے میری وہی صورت پیش ہو جیسی کہ وہ تھی یا جیسی کہ وہ ہے روکنے والے جواب دیتے تھے کہ جو تھا وہ گذر گیا اس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ جو موجود ہے اسی کا تذکرہ کافی ہے۔

بمبئی میں با اتفاق سے گجرات و کاٹھیاواڑ کے تمام چیدہ و منتخب مرید جو باعتبار زمانہ شناسی اور نئی تعلیم کے کمالات کے چیدہ و منتخب سمجھے جا سکتے ہیں جمع تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن میں سے اکثر میری ابتدائی حالت کے شریک اور رازدار رہ چکے تھے مثلاً غلام نظام الدین قریشی بی اے احمد آبادی۔ رضاء الحق عباسی پرائیوٹ سکریٹری نواب صاحب منگرول۔ ولی محمد مومن پرائیوٹ سکریٹری ریاست مانادور اور نواب فیض محمد خاں آف کھمبائت۔ چاند میاں بی اے۔ آف کھمبائت وغیرہ۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ آپ بیتی کا مسئلہ پیش ہوا۔ اور اہل مجلس کے دو حصے ہو گئے۔ ایک فریق کہتا تھا سب کچھ درج ہونا چاہئے۔ اس کے سرغنہ مسٹر ولی محمد مومن تھے۔ دوسرا کہتا تھا نہ ہونا چاہئے۔ اس کے لیڈر مسٹر رضاء الحق عباسی تھے۔ دونوں کی دلیلیں زبردست تھیں آخر فیصلہ کچھ نہ ہوا۔ اور میری مرضی پر بات منحصر رہ گئی۔

میرے فاضل دوست جناب مولوی عبدالماجد صاحب مصنف فلسفہ جذبات فلسفہ اجتماع وغیرہ نے بھی رائے دی کہ سب واقعات بے کم و کاست ہونے ضروری ہیں۔ اس سے مجھے تقویت ہوئی۔ اور میں نے کتاب لکھنی شروع کر دی۔ اسی اثنا میں حضرت مولانا سید اکبر حسین صاحب جج الہ آبادی کا حکم پہنچا کہ جن سے میں نے مشورہ لیا تھا۔ کہ وہ واقعات ہرگز درج نہ کئے جائیں ان سے کچھ حاصل نہیں حضرت اکبر کے ارشاد کے بعد میں مجبور ہو گیا۔ کیونکہ میرے عقیدہ میں ان کی رائے

تمام ہندوستان کے باشندوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ وزنی تھی۔ اسی زمانہ میں
جناب الصمد بندی عرف امی صاحبہ نے ریاست کوٹہ سے حضرت اکبر کی تائید میں ایک
مستند خط لکھا جس میں آیات واحادیث واقوال مشائخ کے حوالے جمع کر کے
مجھکو اس حرکت سے روکا گیا تھا۔ امی صاحبہ عالمہ ہیں فاضلہ ہیں اور کوچۂ تصوف
میں بڑے پایہ کی کاملہ اور عارفہ ہیں۔ ان دو خطوں کو دیکھنے کے بعد میں نے مجبوراً بادل
ناخواستہ کاپی نویس کو منع کر دیا کہ ان حالات کو کتاب میں نہ لکھا جائے۔

واحدی صاحب اور بھیا احسان کو اسکا افسوس ہوا۔ اور بھیا احسان نے
آخر دیباچہ میں اس کا ذکر کر ہی دیا۔

جناب غلام نظام الدین صاحب خاکسار عالم تاجر کتب جن کے نام یہ کتاب
منسوب ہے اور جن کا حال کتاب ہذا سے اچھی طرح معلوم ہو جائیگا۔ اتنی تفصیل
سے بھی ناراض ہوئے جو میں نے اس کتاب میں لکھدی ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ
چوری کرنے کا ذکر اور جوتیوں پر بیٹھنے کا اظہار میری شان موجودہ کے سراسر منافی
ہے اس سے میرے دشمن مجھ کو ذلیل اور حقیر خیال کرینگے۔

جناب خاکسار صاحب نے یہ رائے جس سچی محبت سے دی اسکا میں شکرگذار ہوں
کیونکہ انکی نظر میں میری بہت بڑی شان اور عزت ہے مگر میں خود اپنے گریبان میں منہ
ڈالکر دیکھتا ہوں تو شرم آتی ہے کہ میں کسی شان کا مستحق بھی نہیں ہوں اور احباب
میں جو کچھ حسن ظن میری نسبت قائم ہو گیا ہے یہ سب خدا کے فضل سے ہے۔

میں نے سب کچھ اس کتاب میں لکھدیا ہے اور جو رہ گیا وہ کچھ اتنا اہم نہ تھا
کہ جس کے نہ ہونے سے کتاب ناقص سمجھی جائے۔

مرنے کے بعد ہر شخص کے حالات پر بحث کی جاتی ہے اگر اسکا تعلق پبلک سے رہا ہو
مگر یہ میری خوش نصیبی ہے کہ جیتے زندگی میں میری نسبت لوگوں کو شبہ ہوا اور چونکہ

بہا جوش کرتے ہوئے سن لیا اور دیکھ لیا اور جو لطف مرنے کے بعد روح کو آتا وہ مجھکو جسم و روح کے اجتماع ہی میں حاصل ہو گیا۔

ترتیب وغیرہ کی نسبت بہیا کی رائے صحیح ہے کہ جلدی میں بعض خامیاں اس کتاب کی درست نہ ہو سکیں۔ اب میں خدا کا شکر اور خواجہ بانو اور رواجدی صاحب اور بہیا احسان کے دیباچوں کی نسبت اپنی ممنونیت ادا کرکے اردو زبان میں آپ بیتی لکھنے کا افتتاح کرتا ہوں۔ تاکہ اس ابتدائی نقشہ و خاکہ پر دوسرے لوگ بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کرکے دکھائیں۔

(حسن نظامی)

پہلا دیباچہ

(از جناب لیلیٰ خواجہ بانو صاحبہ)

خدا کا شکر ہو کہ جو باتیں ہم زبانی سنا کرتے تھے انہیں سے بعض اس کتاب میں جمع ہو گئیں۔ خواجہ صاحب کا یہ فرمانا بالکل درست ہے کہ ہر آدمی کی زندگی خود اس کے لئے اور دوسروں کے واسطے نصیحت ہے اگر وہ اسپر غور کرے۔ یہ کتاب بھی ایک نصیحت نامہ ہے۔

لاہوتی آپ بیتی

کو میں بالکل نہیں سمجھی اور شاید بہت کم آدمی اسکو سمجھیں گے۔ میں نے خیال کیا تھا کہ شاید خواجہ صاحب ہندوؤں کی طرح آواگون کے قائل ہیں کیونکہ آپ بیتی لاہوتی کے پڑھنے سے یہی شبہ ہوتا ہے۔ جب پوچھا تو انہوں نے کہہ دیا نہیں میں تناسخ یا آواگون کا قائل نہیں ہوں۔ میں نے اس مضمون میں جو کچھ لکھا ہے وہ کسی اور چیز کا بیان ہے۔

اپنی بہنوں سے کہتی ہوں

جو اس کتاب کو پڑھیں کہ وہ بھی اس طرح اپنی زندگی پر غور کیا کریں جن بہنوں کو خدا نے

دولت دی ہے ان سے کہتی ہوں کہ یہ کتاب غریب بہنوں کو خرید کر تقسیم کریں۔

جو بہنیں میرے پیر اور میرے شوہر خواجہ صاحب کی مرید ہیں ان سے میرا کہنا یہ ہے
کہ اور عورتوں کو بھی یہ کتاب پڑھ کر سنایا کریں تاکہ انکو بھی اس زندگی کے بیان سے
نصیحت حاصل ہو۔

ہر مرید کی چاہت

یہ ہوتی ہے کہ سب آدمی اس کے پیر کے مرید ہو جائیں میری پیر بہنوں کو بھی چاہیے کہ
اپنی جان پہچان عورتوں کو اپنے پیر کے حالات کی یہ کتاب سنا کر اپنی پیر بہن بنائیں
کہ جتنی زیادہ گنتی ہماری پیر بہنوں کی ہوگی اتنی ہی زیادہ آپس کی محبت بڑھے گی کیونکہ
پیر بہنوں میں ماجائی بہنوں سے بھی زیادہ محبت ہوتی ہے۔

اس کتاب سے میں نے کیا حاصل کیا

میں نے اس کتاب سے یہ حاصل کیا کہ آدمی کو اپنا برا اور تکلیف کا وقت اچھے اور خوشی
کے زمانہ میں یاد کرنا چاہیے اس سے اسکو غرور نہیں ہوتا۔

اور یہ حاصل کیا کہ آدمی وہی ہے جو نکما نہیں رہتا اور کام میں وقت خرچ کرتا ہے۔
اور یہ حاصل کیا کہ بناوٹ اور ریاکاری اور دکھاوے کے بغیر بھی سیدھی سادی زندگی
رکھنے سے آدمی دنیا میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اور یہ حاصل کیا کہ پیر لوگ اگر خواجہ صاحب
کی طرح محنت مشقت سے روزی کمایا کریں اور مریدوں کی نذر و نیاز کا خیال نہ کریں
تو وہ بھی نصیحت کرنے میں بے خوف ہو جائیں۔ خدا مجھکو اور میرے بچوں حسین نظامی
و ملا بلال اور سب مسلمان عورتوں اور بچوں اور مردوں کو دنیا میں اسکی توفیق دے
کہ اس کی بخشی ہوئی زندگی کی قدر کریں اور اُسکی عبادت اور اس کے بندوں کی خدمت
کا حق ہم سے ادا ہو۔ آمین۔

خاکسار علی - خواجہ بانو۔

دوسرا دیباچہ

(از جناب ملا محمد الواحدی صاحب ایڈیٹر اخبار خطیب و رسالہ نظام المشائخ دہلی)

سیدی و مولائی حضرت خواجہ حسن نظامی کی تحریریں جہاں اور بہت سی خوبیاں ہیں اور
خوبیاں کیا وہ ایک انیلے اسٹائل کے بانی اور خاتم ہیں وہاں ایک خصوصی و امتیازی خوبی
ان میں ایک یہ بھی ہے کہ انکو سب سے انوکھے اور نرالے مضمون سوجھتے ہیں اور جن عنوانوں پر دوسرا
قلم نہیں اٹھا سکتا۔ انپر یہ ستھرے سے ستھرے رنگ ڈالتے ہیں اس طرح کہ ہر سطر اور ہر لفظ کیفیت و اثر
میں ڈوبا ہوتا ہے۔ کتاب ہذا اسی شہنشاہ قلم کی آپ بیتی خود نوشت سوانحعمری یا بایو
گرافی ہے۔ پھر سمجھ لیجئے کہ اس میں کیا کچھ دلچسپی کے سامان نہوں گے۔ میں نے آپ بیتی
خواجہ حسن نظامی کو سرسری نظر سے دیکھا۔ میرے نزدیک کم از کم اردو لٹریچر میں ایک بالکل
جدید اضافہ ہے۔ آپ بیتی خواجہ حسن نظامی کی لکھی [illegible] ہے اور اس میں مجھے صرف ندرت
و جدت کی تلاش کرنا چاہئے۔ اول تو جیسا اوپر کہہ چکا ہوں۔ خود نوشت سوانحعمری کا
ہمارے ہاں دستور ہی کہاں ہے۔ علاوہ ازیں آپ بیتی خواجہ حسن نظامی جیسی بایو
گرافی تو شاید اردو زبان میں آپ کسی کی پیش نہیں کرسکتے آپ بیتی میں خواجہ صاحب
نے اپنے عیب و ہنر کو اتنی صفائی سے بیان کیا ہے کہ ان کے سوا اتنی صفائی برتنے
والا مشکل سے ملیگا۔ آپ بیتی خواجہ صاحب نے خاص طور سے اپنے مریدوں کے
لئے طیار کی ہے اور اسکی طیاری میں ابتدا تا انتہا مرید ان کے سامنے رہے ہیں
لیکن غیر مرید بھی اس سے مریدوں کے برابر حظ و فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔ لوگ
فرضی افسانوں سے اخلاقی نتائج نکالتے ہیں اور دنیا ان سے محظوظ و مستفید ہوتی
ہے مگر کاش ہم حقیقی زندگیوں سے سبق سیکھنے کے عادی ہوجائیں کہ وہ بہترین افسانہ
اور بہترین نتائج ہیں۔ یہ تو یہ تھا کہ زندگی کا حال تھا۔ نامور دنیا اور خواص

کی زندگی کا ذکر ہے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی گو بڑے برگزیدہ خاندان کے فرد ہیں۔ مگر پیدا جب ہوئے کہ اس خاندان کی برگزیدگی خاک میں مل چکی تھی۔

سونے سے سونا نکلے تو تعجب نہیں لیکن خاک سے سونے کا نکلنا بڑی بات ہے خواجہ صاحب سونا ہیں جو خاک سے نمودار ہوئے۔ ان کی زندگی کا معمولی سے معمولی واقعہ سبق آموز ہے۔ نصائح کا گنجینہ ہے

صاحبان عزت وثروت کی اولاد آج ہزار کوشش وسعی کے باوجود بزرگوں کی عزت وثروت کو مٹائے دیتی ہے۔ مگر خواجہ صاحب کی زندگی بتاتی ہے کہ غریبوں کے بچے اگر تعلیم وتربیت پا سکیں تو ان میں ترقی کی کیا کچھ اہلیت ہے۔ خواجہ صاحب نے حسب عادت زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات لئے ہیں اور قریباً کل واقعات سے ایک نتیجہ نکالکر بتلایا ہے آپ بیتی گویا متعدد اور چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں جن سے نتائج اخذ کئے گئے ہیں مسلسل مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو ہمیں ہماری زندگی کے راستے میں روشنی دکھاتا ہے۔ اردو کی گلستاں ہے۔ تجربات حیات ہے۔ کتاب النصائح ہے کتاب الاصلاح ہے۔

عبد الماجد

واحدی

تیسرا دیباچہ

(از جناب مولوی شیخ محمد احسان الحق صاحب قادری ایڈیٹر رسالہ اسوۂ حسنہ دہلی)

مصور فطرت سیدی حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے فن انشاپردازی میں جو قابل رشک کمال پیدا کیا ہے اس کے خط و خال کو نمایاں کرنے کے لئے ایک طویل مضمون اور مستقل بحث کی ضرورت ہے اور اس فرض کو وہ حضرات جو زیادہ اہل ہیں مناسب موقعوں پر کچھ ادا کر چکے ہیں اور آیندہ ادا کرینگے۔ میں یہاں صرف آپ بیتی تک اپنی رائے زنی کو محدود رکھکر یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ وہ کیسی کتاب ہے اسکی اشاعت سے اردو علم ادب اور قوم و ملک کو کیا نفع ہوگا اور اسکی تالیف و تحریر میں خواجہ صاحب سے کہاں کہاں لغزشیں ہوئی ہیں۔ جہانتک مجھے علم ہے اردو کے کسی مشہور مصنف یا اہل انشاپرداز نے اپنی مبسوط سوانحعمری خود لکھکر ایک مستقل کتاب کی صورت میں شائع نہیں کی۔ اس لحاظ سے آپ بیتی کی اشاعت اردو علم ادب میں ایک نئی اور قیمتی دلچسپی کا اضافہ کرے گی اور یہ دلچسپی ایسی مفید ہو گی کہ اسکے لئے حامیان ادب اردو کو یقیناً خواجہ صاحب کا ممنون ہونا پڑے گا۔

خواجہ صاحب کی زندگی کے حالات شروع سے آخر تک نہ صرف دلچسپ بلکہ سبق آموز اور مفید بھی ہیں کیونکہ خواجہ صاحب بھی ہندوستان کے ان چند منتخب نفوس میں ہیں جنکو انگریزی میں "سلف میڈ" کہا جاتا ہے یعنی محض جنہوں نے غریب اور علم و روشن خیالی سے تقریباً بے بہرہ سرپرستوں کی نگرانی میں معمولی تربیت پاکر اور سخت عسرت و گمنامی کی حالت سے خود ترقی کرکے حاسدوں کی شدید مخالفتوں کے باوجود اس بام شہرت و کمال پر اپنا جھنڈا نصب کیا ہے جس کی طرف دیکھنے سے ان کے حریفوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں اور جس کی آستاں بوسی کو

آج دولتمند بھی باعث فخر سمجھتے ہیں اور علم پرست بھی۔ پھر یہ تمام عروجِ کمال جو خواجہ
صاحب کو حاصل ہوا ہے صرف انکی فطری وکسبی قابلیت ذاتی کوششوں کا رہین منت
ہے۔ نہ کہ کسی اتفاقیہ خوش قسمتی یا دوسروں کی غیر معمولی دستگیری کا۔ ایسے لوگوں کے
حالات جو خود اپنی کوشش وقابلیت سے ترقی کر کے انتہائی پستی سے معراج کمال پر
پہنچے ہیں اول تو یونہی خود ہی سبق آموز اور مفید ہوا کرتے ہیں لیکن جس اعجاز رنگ
میں اپنے مختلف الحیثیت حالات کو خواجہ صاحب نے تحریر کیا ہے اور جس معلمانہ اہتمام کے
ساتھ ان سے نتائج اخذ کر کے مریدوں اور متوسلوں کو مستفید کرنے کی کوشش کی
ہے اس سے انکی آپ بیتی اصلاحی اعتبار سے اور بھی زیادہ قابل قدر ہو گئی ہے جو ہمارے
سامنے ایک مختلف کمالات رکھنے والے بزرگ کی کامیاب زندگی کا نمونہ پیش کر کے
خود ہم کو بہترین طریقے سے کامیاب بننے کی تلقین کر رہی ہے۔ ”سلف صالحین“ لوگوں
کی سوانح عمریوں کے مطالعہ کو زندہ قومیں اپنی ضروریات زندگی میں شمار کرتی ہیں اس لئے
خواجہ صاحب جیسے ”سلف صالحین“ بزرگ کی خودنوشت سوانح عمری آپ بیتی اردو میں ایک
ایسی کتاب ہوگی جسکو غیر اردو داں قومیں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گی اور جس کی
ضرورت اور نفع رسانی ہمارے ملک میں روز بروز بڑھتی جائے گی۔

خواجہ صاحب نے آپ بیتی میں اپنی زندگی کے کل حالات من وعن اور بے کم و کاست
لکھے ہیں یا نہیں اور انکو قلمبند کرنے میں ذاتی یا اجتماعی مصلحتوں کی بنا پر کچھ قطع
وبرید کی ہے یا نہیں؟ ۔ ان سوالوں کا جواب آپ بیتی کے ان پڑھنے والوں کو جو خواجہ
صاحب کے حالات سے بطور خود واقف نہیں ہیں۔ آپ بیتی میں مشکل سے ملیگا
لیکن جو لوگ خواجہ صاحب کے ساتھ عرصے سے دوستانہ یا نیاز مندانہ تعلقات
رکھتے ہیں وہ بلا تامل یہ کہدینگے کہ حالات کل نہیں ہیں اور ان میں کچھ قطع وبرید
بھی ہوئی ہے اور یہی میرے نزدیک آپ بیتی میں وہ سب سے بڑا نقص ہے جو کہ

گو اس کی نفع رسانی اور دلچسپی پر شاید زیادہ مضر اثر نہیں ڈالا ہے۔ لیکن اس کے
موضوع تالیف یعنی تاریخی اہمیت کو بہت گھٹا دیا ہے۔ مجھکو معلوم ہے کہ خواجہ صاحب
نے انتہائی جرات و صداقت سے کام لیکر اپنے تمام حالات کو من و عن قلمبند کر لیا تھا
لیکن بعض بزرگوں اور دوستوں کے سخت اصرار پر انکو بہت سے حصے مسودہ میں سے
علیحدہ کرنے پڑے اور کچھ حصوں پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کاش اس
کتاب کا مسودہ اپنی اصلی شکل میں برقرار رہتا اور بزرگان و احباب کی مصلحتیں
اس کی تاریخی اہمیت کا خون نہ کرنے پاتیں۔ خواجہ صاحب اور ان کے
بعض دوستوں کو اس کا احساس نہ ہو لیکن مجھکو یقین ہے کہ انکی زندگی اپنے
دلچسپ نشیب و فراز میں بہت سی تاریخی اہمیتیں پوشیدہ اور نمایاں رکھتی ہے
اور جو داغ دھبے آج بعض لوگوں کو اس میں سیاہ و بدنما نظر آتے ہیں وہ بھی آئندہ
نسلوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ بحالت موجودہ بھی
خواجہ صاحب نے اپنی عیب نمائی میں بہت ہی غیر معمولی جرات و صداقت سے
کام لیا ہے اور آجکل ان کی حیثیت کے کسی شخص سے اتنی جرات و صداقت کے
اظہار کی بہت کم توقع ہو سکتی ہے۔ لیکن میں آپ بیتی کو بہت زیادہ قابل قدر
بلکہ دنیا کی ایک بہترین کتاب سمجھتا اگر وہ حصے بھی جو مسودہ میں سے خارج کر دئے
گئے ہیں اس میں شائع کر دئے جاتے۔

جس جرات و صداقت کے ساتھ خواجہ صاحب نے آپ بیتی میں اپنے
عیبوں کو ظاہر کیا ہے افسوس ہے کہ اپنی خوبیاں بیان کرنے میں اتنی جرات
و صداقت سے کام نہیں لیا۔ عجز و انکسار کے جذبہ اور خودستائی کا الزام
آنے کے اندیشہ سے انکو اپنی بہت سی واقعی خوبیوں کے اظہار سے باز رکھا
اور جہاں کچھ خوبیاں بیان کی ہیں وہاں انکی اہمیت کو گھٹانے کے لئے بھی

آپ کو بچہ نہ سمجھے کوشش ضرور کرنی پڑتی ہے۔ اپنی سوانح عمری آپ لکھنے والے
کو اس قسم کی دقتیں ضرور پیش آتی ہیں۔ اس لئے ہر شخص کو اس میدان میں
قدم رکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ خواجہ صاحب نے ان دقتوں کا بڑی بہادری
اور استقلال سے مقابلہ کیا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس مقابلہ
میں ہر جگہ کامیاب ہوئے ہیں۔

خواجہ صاحب نے آپ بیتی میں اپنے کیرکٹر کی ایک کمزوری یہ بیان کی
ہے کہ وہ واقعات کی ظاہری شکل اور ان کے سطحی نتائج سے جلد متاثر و مرعوب
ہوجاتے ہیں۔ اس کا ثبوت آپ بیتی میں بھی ملتا ہے۔ اپنی زندگی کے بعض
حالات سے جو اصلاحی نتائج خواجہ صاحب نے اخذ کئے ہیں ان میں بعض
ایسے بھی ہیں جو محض سطحی ہیں۔ اور جن کے اخذ کرنے میں فلسفیانہ دقت نظر کی بجائے
شاعرانہ احساسات اور تخیلات سے کام لیا گیا ہے اس لئے آپ بیتی کے واقعات
پر خواجہ صاحب کے حواشی سب قابل تسلیم نہیں ہیں۔ اگرچہ وہ بھی اس اعتبار
سے ضرور کارآمد ہیں کہ ان سے خواجہ صاحب کے طریقہ استنباط نتائج پر
روشنی پڑتی ہے۔

جدت طرازی و ندرت آفرینی نہ صرف خواجہ صاحب کے تخیل و انشا
پردازی کا بلکہ انکی زندگی کے تقریبا ہر ایک شعبہ کا جزو لاینفک بنگئی ہے اور
کبھی کبھی خواجہ صاحب اپنی اس قابل رشک قابلیت کو بے محل بھی استعمال
کرجاتے ہیں۔ چنانچہ شاید اسی خیال جدت طرازی نے کہ آپ بیتی کی ترتیب
بھی دوسری سوانح عمریوں کی ترتیب سے ممتاز رہے آپ بیتی کے مضامین میں
ایک قسم کی الجھن پیدا کردی ہے۔ شروع میں اپنی زندگی کا مجمل حال لکھا ہے
جس میں بہت سی جزئیات بھی آگئی ہیں۔ جہاں جزئیات کو تفصیل وار بیان

گیا ہے وہاں بہت سی باتیں محل رہ گئی ہیں۔ درگاہ حضرت محبوب الٰہی میں سکونت کی وجہ بیان کرنے کے لئے جو باب قایم کیا ہے وہ زیادہ تر بیان نسب سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح کی اور بھی چند خرابیاں ترتیب میں ہیں جن سے واقعات کے تاریخی تسلسل میں رخنے پڑتے ہیں۔

مذکورہ بالا چند خامیوں اور لغزشوں کے باوجود خواجہ صاحب نے آپ بیتی بہت اچھی لکھی ہے۔ اردو ادب میں وہ ایک قیمتی اضافہ ثابت ہوگی۔ مشہور لوگوں کو اسے پڑھ کر اپنی سوانحمریاں خود لکھنے کا شوق پیدا ہوگا۔ آئندہ نسلیں اس سے معتدبہ فائدہ حاصل کریں گی اور ایک بڑے شخص کی قابل تقلید زندگی کے اہم حالات اس کے ذریعے سے محفوظ ہو جائیں گے۔

احسان۔ غفرلہ

خواجہ حسن نظامی   آپ بیتی

یا معین   ہو الکامل   یا پیر

آپ بیتی حسن نظامی

جو

کتاب الی اللہ پیر بھائی کا ایک حصہ ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

احمدک واستغفرک واستعینک یا اللہ

صلاتی وسلامی بعبدک ورسولک یا اللہ

یا اللہ۔ میری مدد کر۔ میں یہ کتاب تیرے اُن بندوں کے لیے لکھتا ہوں جنھوں نے تیری محبت۔ اور تیری طلب۔ اور تیرے دین اسلام کی حقانیت جاننے حاصل کرنے کو میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ اسی واسطے میں نے اس کتاب کا نام پیر بھائی رکھا ہے۔ کہ تو ہم سب کا پیر ہے۔ اور ہم آپس میں (تیرے مرید ہونے کے سبب) پیر بھائی ہیں۔

تو مراد ہے۔ ہم مرید ہیں۔ تو حقیقت ہے۔ ہم مجاز ہیں۔ تو جڑ ہے ہم شاخیں ہیں۔ تو نور السموات والارض ہے۔ ہم تیری شعاعیں ہیں۔

ظاہر میں میرا ہاتھ تیرے بندوں کو مرید کرتا ہے اور انکی بیعت لیتا ہے۔

مگر باطن میں تیرا ہی ہاتھ ہمارے ہاتھوں پر ہے اور تو ہی ہمارے ہاتھوں پر اپنا
ہاتھ رکھکر بیعت قبول کرتا ہے۔ جیسا کہ تو نے قرآن شریف میں فرمایا ہے۔

ید اللہ فوق ایدیھم (خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے) پس مجکو
توفیق دے کہ اپنے ہاتھ پر مرید ہونے والوں کو اپنے وجود سے کمتر نہ سمجھوں۔ اپنی ذات
کو پیر اور مراد خیال نہ کروں۔ بلکہ تجکو مراد اور پیر تصور کر کے اپنے مریدوں کو تیرا
مرید۔ اور اپنا پیر بھائی جانوں۔ اور انکی خدمت اس طرح بجا لاؤں جس طرح برابر کا
بھائی اپنے دوسرے بھائی کی کرتا ہے۔

یا اللہ تو ہی اپنی قدرت سے میرے دل کو اس کبر و غرور سے پاک رکھ سکتا ہے
جو آجکل بعض پیروں پر مسلط ہے اور وہ مریدوں کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ اور اپنی
ہستی کو مریدوں سے اتنا بڑا خیال کرتے ہیں جتنا تو اپنے بندوں سے بڑا ہے۔ الہی
مجکو اس گھمنڈ سے بچا۔ اور کسی قسم کی بڑائی اور خودبینی میرے اندر نہ آنے دے۔

اے مولی۔ جس طرح تیرے محبوب اور رسول بندہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ
وسلم تیرے مرید تھے۔ اور تیرے ہی نام پر تیرے بندوں کو اپنے ہاتھ کے ذریعہ تیرا
مرید کرتے تھے۔ اور باوجود اس بزرگی کے ان کی برابر تو نے کسی پیغمبر اور کسی انسان
کو مرتبہ بلند نہیں دیا وہ اپنی ذات مبارک کو سب آدمیوں کی اور اپنے سب مریدوں
کی برابر تصور فرماتے تھے۔ تصور ہی نہیں ان کے عمل سے ثابت ہوتا تھا کہ کوئی شخص
جو ان کا مرید ہو جاتا تھا کسی حال میں بھی حقیر اور اپنے سے کمتر نہیں سمجھتے تھے۔

اسی طرح مجکو کہ تیرے محمد رسول کا خادم ہوں ایسا دل اور ایسی عبادت
مرحمت فرما کہ میرے نفس کو پیری اور بزرگی کا غرور پیدا نہ ہو۔ اور میں تجکو اپنا پیر
اور تیرے بندوں کو پیر بھائی سمجھتا رہوں۔ اور میرا عمل بھی اسی کے موافق رہے۔

یا اللہ اپنی عاجزی کے اظہار اور تیری اطاعت کی طلب کے بعد اب میں تجھ سے

ان بندوں کی انکساری و اطاعت کی دعا بھی کرتا ہوں جو میرے ہاتھ پر تیرے مرید ہوئے ہیں۔ جس طرح کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا دل اپنی پیری اور بزرگی پر گھمنڈ نہ کرے۔ اور سب مریدوں کو برابر کا بھائی سمجھے۔ اسی طرح میں مریدوں کے لیے بھی تجھ سے مانگتا ہوں کہ ان کو بھی اطاعت و ادب کی توفیق دے اور ان کو یورپ کے ان نافرمان بندوں کی طرح نہ بنا جو اپنے بادشاہوں اور پیشواؤں کا حکم نہیں مانتے۔ اور تیرے بنائے ہوئے قواعد خسروی و بزرگی کو توڑ توڑ کر اپنی مطمئن زندگی کا شیرازہ پراگندہ کر رہے ہیں۔

الٰہی میرے مریدوں کو ویسی ہی اطاعت و حکم برداری سکھا جیسی تو نے اپنے رسول حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے مریدوں (صحابہ کرامؓ) کو سکھائی تھی۔ کہ وہ رسولؐ کی آواز سے اپنی آواز بلند نہ کرتے تھے۔ اور رسولؐ کے حکم کے سامنے اپنی عقلوں و اپنی تمام خواہشوں کو دبا دیتے تھے۔ رسولؐ کی بات کو سب باتوں سے افضل جانتے تھے اور رسولؐ کی خوشی کو سب مرضیوں سے اعلےٰ رکھتے تھے انکو یقین تھا کہ رسولؐ کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے۔ کیونکہ قرآن شریف نے بھی ایسا ہی ارشاد فرمایا تھا۔ اسی لیے وہ اطاعت رسولؐ پر اپنی جانوں۔ اپنے مالوں اور اپنی عزتوں کو قربان کر دیتے تھے۔

خدایا یہ تیرے ہی فضل سے تھا کہ تیرے رسولؐ غریبوں اور مسکینوں کو برابر کا بھائی سمجھتے تھے۔ اور اپنی زندگی غریبانہ بسر کرنی پسند فرماتے تھے۔ اور اپنی بڑائی و برتری کا کوئی برتاؤ مریدوں سے نہ کرتے تھے اور وہ مرید بھی (صحابہؓ) ان کی بڑائی و بزرگی کے سامنے دل و جان سے جھکے رہتے تھے۔

ایسا ہی یا اللہ ان لوگوں کو بنا دے جنہوں نے میرے ہاتھ پر تیری بیعت کی ہے۔ کہ وہ بھی میرے احکام کو اگر وہ تیرے احکام کے خلاف نہ ہوں تسلیم کریں

اور میرے ادب کو (جو درحقیقت تیرے محل کا ادب ہے) ہر حال میں ملحوظ رکھیں
کیونکہ ان کے بغیر انکی دینی و دنیاوی فلاح ممکن نہیں ہے۔ اور اطاعت ہی ان کے طرز
عمل کی بہتر جان رہنا ہو کر ان کو مراد مند کر سکتی ہے جیسا کہ مجھے پہلے اطاعت ہی نے
تیرے بندوں کو مراد مند دونوں جہان میں کیا تھا۔

یا اللہ اس دعا کو قبول کر۔ آمین۔ اور میرے ارادہ اور نیت کو صحت
دے کہ اب میں وہ بیان کروں جو تیرے مرید بندوں اور میرے پیر بھائیوں
کو دین دنیا میں مفید ہو۔

حسن نظامی کی ہستی اور انکی زندگی کا حال

اس کتاب میں ہر پیر بھائی اور ہر پیر بہن کا مختصر حال ایک مخصوص نقشہ
کے اندر ہے۔ جو اس نے خود لکھا ہے یا لکھوایا ہے۔ جسمیں اسکی قومیت۔ عمر۔ حلیہ
وغیرہ کی تشریح ہے۔ (اب اسکے بعد نئے مریدوں کے ناموں کی کتاب علیحدہ شائع ہوگی۔ حسن نظامی)
میں بھی ان کا بھائی ہوں۔ اور چاہیے اپنی حالت کو اسی نقشہ کے مطابق
ذرا وضاحت سے لکھتا ہوں۔

میرا نام علی حسن۔ عرف حسن نظامی۔ والد کا نام حافظ سید
عاشق علی۔ والدین زندہ نہیں ہیں۔ میں بارہ سال کا تھا جب ان کا انتقال ہو گیا۔
میری قومیت سید ہے۔ پیدائش کا مقام بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء
پرانی دہلی ہے۔ اور وہیں آجکل اقامت ہے۔ معاش کتابوں اور دعاؤں کی تجارت ہے۔
تعلیم عربی۔ فارسی۔ سادہ۔ عمر ۳۱ سال۔ حلیہ یہ ہے۔ بہت لمبا قد۔ اس قدر دبلا کہ
سوائے ہڈیوں اور کھال کے گوشت کا نام نہیں۔ رنگ گورا۔ چہرہ کتابی۔ آنکھیں

سفید و سیاہ۔ اور بڑی بڑی۔ دونوں بھوؤں کے وسط میں ہلکا سا ایک سرخ نشان (جسکو بچپن سے آجتک پیشین گوئیاں کرنے والوں نے خوش نصیبی کی علامت بیان کیا) پیشانی چوڑی۔ ناک سیدھی۔ رخسارے نہ بہت پچکے ہوئے نہ گوشت سے بھرے ہوئے۔ ہونٹ موٹے موٹے۔ دہانہ بڑا۔ دانت ابتک سلامت۔ ڈاڑھی گھنی ابھری ہوئی۔ سر کے بال کمر تک۔ جنمیں بل ہیں۔ یعنی گھونگر والے ہیں۔ سینہ بہت چھوٹا جیسا کہ بارہ سال کے بچہ کا ہوتا ہے۔ سینہ کی ہڈیاں اتنی ابھری ہوئی کہ ایک ایک ہڈی گن لو۔ ان پر گوشت بالکل نہیں۔ گردن بہت پتلی اور خمیدہ (بچپن میں بہت لمبی اور بہت سیدھی تھی) گردن سے ناف تک کا حصہ بہت لمبا اور یہی وجہ ہے کہ کمر چلنے میں ذرا جھکی رہتی ہے کان درمیانی۔ ٹانگیں لمبی۔ پاؤں درمیانے

سر لمبوترا۔ اور بڑا۔

آواز بہت بڑی۔ اور ذرا گرجدار، جو لحن کی شیرینی نہیں رکھتی اگر گانے کی کوشش ہو تو بہت بھدی اور مکروہ معلوم ہوگی) بال بالکل سیاہ۔ جسم کے کسی عضو میں کمزوری نہیں ہے سوائے جگر اور معدہ کے کہ دماغی کام کرنے سے وہ عموماً خراب رہتے ہیں۔ دماغ میں اب تک شدید سے شدید محنت کی برداشت ہے۔ اور رات دن میں بارہ گھنٹے مسلسل کام کر سکتا ہے۔

زبان میں پہلے بہت لکنت تھی۔ اب بھی کبھی کبھی بولنے میں گرفت ہوتی ہے حافظہ درست نہیں ہے۔ گفتگو میں اسوجہ سے سلسلہ کلام قائم نہیں رہتا۔

ڈاڑھی صرف ایک دفعہ منڈوائی تھی۔ پھر کتروانے لگا۔ اب پوری ہے سالہا سال سے۔

شادیاں دو ہوئیں۔ پہلی بیوی سے چار بچے ہوئے۔ ابن حسن نظامی حسن بصری حور بانو۔ نور بانو۔ اس بیوی کا انتقال ہوگیا۔ اور سوائے حور بانو کے تینوں بچے بھی

مرنگی۔ سابقہ اہلیہ کے انتقال کے سات برس بعد دوسرا عقد کیا۔ ان سے
ایک لڑکا حسین نظامی ہے جو اسوقت ڈھائی سال کا ہے۔ اور دوسرا لڑکا علی ہلال دو
مہینہ کا ہے۔ میں گیارہ سال کی عمر میں اپنے مرحوم والد کے ہمراہ سب سے پہلے تونسہ
شریف ضلع ڈیرہ غازیخان صوبہ سرحدی گیا تھا۔ اور حضرت شاہ اللہ بخش صاحب
رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر حسب ہدایت والد ماجد بیعت کی تھی (جن کے میرے والد اور
تمام خاندان والے مرید تھے) پھر والد کے انتقال کے بعد اپنے برادر مرحوم سید
حسن علی شاہ کے ہمراہ سولہ برس کی عمر میں حضرت خواجہ غلام فرید صاحب رحمۃ اللہ
علیہ سجادہ نشین چاچڑاں شریف علاقہ ریاست بہاولپور کی خدمت میں حاضر ہوا۔
اور بھائی کے کہنے سے ان سے بیعت کی (یہ دونوں ارادتیں اپنے ارادہ اور اپنے
خیال سے نہ تھیں کیونکہ اسوقت اتنی عقل نہ رکھتا تھا) اس کے بعد درگاہ حضرت
بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ میں بمقام پاکپٹن شریف ضلع منٹگمری حضرت مولانا
پیر سید مہر علی شاہ صاحب سے باشارہ روح حضرت بابا صاحب بحسن عقیدت
ثانی ذریعہ صحیح سمجھ کر بیعت کی۔ اسوقت میری عمر ۲۳ سال کی تھی۔ اور میں نے
تعلیم و مطالعہ و مجاہدات کے ذریعہ سے معلومات تصوف کا کچھ ذخیرہ مہیا کر لیا تھا۔

دست بدست مرید ہوا تھا۔ مرید ہونے کے بعد دینی ترقی تو فوراً شروع
ہو گئی۔ اور دنیاوی حالت میں اتنا زوال ہوا کہ فاقہ کشی کرتا رہا۔ معیشت کا اطمینان
سنہ ۱۹۰۶ء سے ہوا جسکو گیارہ سال ہوئے۔ اسکے بعد دنیاوی ترقی بھی برابر عروج
کرتی رہی۔

مرید ہونے کی ترغیب خود میرے دل نے دی۔ میں حضرت خواجہ
اللہ بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ غلام فرید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کامل اور
مکمل پیر تصور کرتا تھا۔ مگر ان کے بقید حیات نہ ہونے کے سبب ایک زندہ ہادی کی

ضرورت تھی۔ اس واسطے اکثر استخارے کیا کرتا تھا کہ کسی رہنما کا پتہ ملے۔ ایک بات
حضرت محبوب الٰہیؒ کو خواب میں دیکھا کہ وہ حضور دریافت فرماتے ہیں کس کے مرید ہو۔
عرض کیا میں خود آپ سے پوچھتا ہوں کہ کس کا مرید ہونا چاہیے۔ فرمایا اپنے آپکو دیکھو۔
میں نے تعبیر لی کہ اصلاح نفس کا اشارہ ہے۔ جسکی تعمیل میں میں نے
مدتوں ان میں دیکھ دیکھ کر مجاہدے کئے۔ اسکے بعد خیال آیا کہ حضرت محبوب الٰہی رضؓ
نے میرے نسب کا اشارہ نہ کیا ہو کہ میں حضرت محبوب الٰہیؓ کے نسب میں ہوں۔ اپنے
آپ کو دیکھنا گویا خود حضرت کے طرز عمل کو دیکھنا ہے۔ اسواسطے ارادہ ہوا کہ جس طرح
حضرت محبوب الٰہی رضؓ اپنے پیر حضرت بابا گنج شکر رضؓ کی خدمت میں دہلی سے پاکپٹن شریف
تک پیدل جایا کرتے تھے۔ میں بھی پیدل جاؤں۔ مگر اتنی ہمت نہ کر سکا تاہم پکن آباد
سے پاکپٹن تک پیدل گیا۔ جو غالباً بارہ کوس کا فاصلہ ہے اور ریگستانی راستہ ہے۔
یہ سفر بہت بے سروسامانی کا تھا۔ نہ کوئی آدمی ساتھ تھا نہ پیسہ جیب میں تھا
نہ روٹی۔ بھوکا پیاسا۔ ایک شوق اور لطف میں روانہ ہو گیا تھا۔ بارہ بجے دن کو دریا
کے کنارہ پہنچا۔ کشتی موجود نہ تھی۔ پیدل چلنے کی عادت نہ تھی۔ راستہ صاف نہ تھا۔ گرمی
کی شدت اور دھوپ کی تیزی سے حواس گم تھے۔ کنارہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ بھوک نے
اتنا بے حال کیا کہ وہیں نیم غشی کی سی حالت طاری ہو گئی۔ اتنے میں کوئی درویش مسافر
آئے ان کے پاس آدھ سیر کی ایک موٹی روٹی تھی۔ اسمیں سے انھوں نے مجکو پاؤ روٹی
دی۔ اور مسکرا کر کہا اسکو کھاؤ۔ پانی پیو۔ ہم تم کو تو روٹی تقسیم کرنی ہو ابھی سے بے ہوش
ہو گئے۔ میں نے وہ ٹکڑا کھایا۔ دریا کا پانی پیا۔ کشتی آگئی اسمیں سوار ہو کر پار گئے اور
شام کو پاکپٹن شریف پہنچ گئے۔

رات کو میں نے حضور بابا صاحب کے مزار پر عرض کیا کہ طلب شیخ میں حاضر
ہوا ہوں۔ صبح کو خود بخود حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب کی طرف دل مائل ہو چلا۔

میں نے اسیوقت ان کے پاس حاضر ہو کر بیعت کر لی۔

یہاں تک تو میں نے مقررہ نقشہ کی موافق تمام امور کا جواب لکھا۔ اب کچھ ذاتی سرگذشت کا حال بھی لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ اس سے آیندہ نسلوں کو فائدہ حاصل ہو اور وہ میری آپ بیتی سے کچھ نتیجہ حاصل کر سکیں۔

ایک عرصہ ہوا میں نے آپ بیتی حسن نظامی کے نام سے ایک کتاب لکھنی شروع کی تھی۔ مگر پھر اسکو ترک کر دیا کیونکہ اسمیں مجھکو خود ستائی کی بو آئی۔ اب خیال آیا کہ پیر بھائیوں کے تجربہ کے لئے اپنے سب نیک و بد حالات مرتب کر دینے مناسب ہیں۔ کہ انہیں ان کو میری زندگی کے تاریک حالات بھی معلوم ہو جائینگے۔ میں کوشش کرونگا کہ اپنی کسی مخفی بات کو پردہ میں نہ رکھوں۔ اور اپنے ان کاموں کو بھی لکھدوں۔ جو لوگوں کی نظر میں اچھے ہیں۔ اور ان کو بھی بیان کر دوں۔ جو عیب۔ گناہ۔ اور خلاف آدمیت ہیں۔

دوسرا آدمی میرے حالات لکھیگا تو چن چن کر خوبیاں جمع کرے گا۔ اور عیبوں کو چھپائے گا۔ اور ضرورت یہ ہے کہ خدا کے بندوں کو دھوکا نہ دیا جائے۔ انسان کی جو اصلی حالت ہو وہ لکھی جائے تاکہ سب اچھی بری باتیں معلوم کر کے دوسرے لوگ اس شخص کی نسبت صحیح رائے قائم کر سکیں۔

اور میرے صحیح حالات کا شائع ہونا تو اسواسطے بھی بہت ضروری ہے کہ میں مرید کرتا ہوں۔ اور ہزاروں آدمی ایسے میرے مرید ہوتے ہیں جنہوں نے مجھکو نہیں دیکھا۔ خط کے ذریعہ مرید ہو جاتے ہیں یا لاکھوں آدمی ایسے ہیں کہ میری تحریریں دیکھ کر حسن عقیدت رکھتے ہیں۔ تو مرید ہوتے وقت ان کو یہ غور کر لینے میں آسانی ہو گی کہ ایسا آدمی پیر بنانے کے قابل بھی ہے یا نہیں۔

درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ میں سکونت کی وجہ

حسن نظامی کے جد اعلیٰ حضرت مولانا سید بدر الدین اسحٰقؒ حضرت بابا فریدالدین
شکر گنجؒ کے داماد تھے۔

حضرت مولانا موصوف دہلی میں مقیم تھے۔ اور تحصیل علوم اسی شہر میں کی تھی۔ دہلی
کے شہرۂ آفاق دانشمندوں اور ممتاز فاضلوں میں اول درجہ پر مانے جاتے تھے۔ بعض
مسائل میں حضرت مولانا کو کچھ شبہات واقع ہو گئے تھے۔ جب دہلی میں کوئی ایسا عالم
ملا جس سے وہ شکوک و شبہات رفع ہوتے تو آپ نے بخارے کا قصد کیا جو ان دنوں
فضلا کا مرکز تھا۔ جب دہلی سے روانہ ہوئے تو اثنائے راہ میں وہ قصبہ اجودھن بھی آیا۔
پٹن شریف کہا جاتا ہے۔ یہاں اس زمانہ میں شیخ الاسلام حضرت
با گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ تشریف رکھتے تھے جنکی بزرگی کا شہرہ چار دانگ
یا ہوا تھا۔ حضرت مولانا جب حضرت گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور
بیٹھے تو حضرت بابا گنج شکرؒ کی زبان مبارک سے بسبیل حکایات و تمثیلات
شکوک و شبہات کا حل سنا جنمیں آپکی طبیعت الجھی ہوئی تھی۔ حضرت مولانا کو
جب ہوا کہ جن مشکل اور دقیق مسائل کے لیے میں بخارے کو جاتا تھا وہ ان درویش
باتوں باتوں میں حل کر کے رکھدیئے۔ اور ایسے آسان اور سیدھے سادے پیرایہ
کہ کسی سوال کی گنجائش ہی نہ رہی۔ اسلیے حضرت مولانا نے حضرت بابا صاحب
وقت بیعت حاصل کی۔ اور قیام دہلی ترک کر کے وہیں پاکپٹن میں اقامت اختیار
لی۔ (اب مزار بھی وہیں ہے)

حضرت بابا صاحب نے بھی ان کے کمالات علمی اور شرافت نسبی کا خیال کر کے
اپنی صاحبزادی حضرت بی بی فاطمہ کا عقد ان سے کر دیا۔ اور حضرت مولانا وہیں رہنے
بسنے لگے۔

جب حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ شروع شروع میں بغرض
بیعت پاکپتن شریف حاضر ہوئے تو حضرت محبوب الٰہیؒ کی نو عمری تھی حضرت بابا صاحبؒ
نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو حضرت مولانا سید بدرالدین اسحٰقؒ کے پاس ٹھہرایا۔ کہ دہلی والے کا
دہلی والے ہی میزبان بنیں۔ اور مدارات کا حق ادا ہو۔

فوائد الفواد اور سیر الاولیاء وغیرہ میں تذکرہ ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے خود فرمایا
کہ حضرت مولانا بدرالدین اسحٰقؒ نے میری روحانی تعلیم و تربیت میں خاص حصہ لیا۔ اور
حضرت بابا صاحب کے آداب مجلسی اور لوازمات شیخوخیت سکھائے۔

حضرت مولانا بدرالدین اسحٰقؒ حسب بیان سیر الاولیاء و فوائد الفواد وغیرہ عالم
اور صاحب کرامات تھے سوز و درد باطن کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت آنکھیں آن
بہتی تھیں۔ اور جہاں خدا رسول کا ذکر سنتے بے اختیار زار و قطار رونے لگ

حضرت مولانا کی متعدد علمی تصانیف تھیں۔ جن میں اسرار الاولیاء مصر
کا مخطوطہ اب بھی موجود ہے۔ اور صرف یا نحو کا ایک رسالہ بھی کہیں کہیں قلمی صو
پایا جاتا ہے۔

حضرت بابا صاحب کی صاحبزادی سے حضرت مولانا بدرالدین اسحٰق
فرزند پیدا ہوئے ایک خواجہ سید محمد امام دوسرے خواجہ سید موسیٰ۔

جب حضرت بابا صاحب اور حضرت مولانا سید بدرالدین اسحٰقؒ کا انتقال ہو
اور حضرت مولانا کی بیوہ دو یتیم بچوں کے ساتھ کچھ تکلیف میں رہنے لگیں اور حضرت محبو
کو اس کی خبر پہنچی تو آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ کیونکہ ایک تو اپنے پیر کی صاحبزادی

حیثیت سے آپ کو بی بی فاطمہ سے ہمدردی تھی۔ دوسرے اپنے روحانی معلم و مربی حضرت سلطان کی اہلیہ ہونے کے سبب آپ کو ان بی بی صاحبہ کا خیال تھا۔

سیر الاولیاء میں مذکور ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے حضرت سید محمد کرمانی عنایت کر پاکپٹن سے ان بی بی صاحبہ کو دونوں یتیم بچوں سمیت دہلی میں بلا لیا۔ اور اپنے پاس نہایت ادب و دلجوئی سے رکھا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے ان بچوں کو بطور متبنّے اور فرزند معنوی کے پرورش کیا اور خاص نگرانی کے ساتھ ان کی تعلیم و تربیت کرائی۔ اور جب سید محمد صاحب کی عمر بڑی ہوئی تو ان کو اپنی امامت عطا فرمائی۔ یعنی حضرت محبوب الٰہیؒ کی نماز میں حضرت سید محمد امام بنائے جاتے ہیں۔ اس وقت سے ان کے نام کے ساتھ لفظ امام شامل ہو گیا۔ اور لوگ ان کو خواجہ سید محمد امام کہنے لگے۔

الاولیاء جو سب سے مستند تذکرہ اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے وقت کی لکھی ہوئی ... لکھا ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ حضرت خواجہ سید محمد امام کو اس قدر ... کہ قطع نظر فرائض امامت کے ان کو ہر وقت اپنی خلوت و جلوت کی صحبت عطا فرماتے تھے۔ یہاں تک نوبت حضرت محبوب الٰہیؒ کو حضرت خواجہ سید محمد امام کی ...گی میں تھا کہ اپنے سامنے خواجہ سید محمد امام سے لوگوں کو مرید ہونے کی ... دیتے تھے اور خواجہ سید محمد امام کو اپنے روبرو دوسروں کو مرید کرنے کی ... ہوتی تھی یہ بہت بڑی بات تھی کہ حضرت محبوب الٰہیؒ خود اپنی موجودگی میں کہ ...ل تھے ایک نو عمر شخص کی بیعت کا دوسروں کو حکم دیتے تھے۔ اور اپنی آنکھوں کے ...نے خواجہ سید محمد کی بیعت دوسروں سے کراتے تھے۔ یہ بیان بھی سیر الاولیاء ...ہے کہ حضرت خواجہ سید محمد امام حضرت محبوب الٰہیؒ کا عطا کردہ لباس زیب تن ...رماتے تھے۔

صاحب سیر الاولیاء کا بیان ہے کہ حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی کی مجلس میں حضرت خواجہ سید محمد امام سے کوئی شخص اونچی جگہ نہیں بیٹھ سکتا تھا نیز حضرت محبوب الٰہی کے اقربا ۔ یاران ۔ خلفاء وغیرہ میں کسی کو یہ درجہ حاصل نہ تھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی موجودگی میں خود میر مجلس یا صاحب سماع بنے ۔ سوائے حضرت خواجہ سید محمد امام کے ۔ کہ ان کو حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ امتیاز مرحمت فرمایا تھا کہ حضرت کے سامنے میر مجلس اور صاحب سماع بنتے تھے ۔ حضرت خواجہ سید محمد امام کے یہ پانچ اوصاف کہ اول تو حضرت محبوب الٰہیؒ کے پہرے حقیقی نواسے تھے ۔ دوسرے حضرت محبوب الٰہیؒ کے معظم روحانی کے فرزند تھے ۔ تیسرے حضرت محبوب الٰہیؒ کے امام تھے ۔ چوتھے یہ کہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے باوجود اسکے کہ ان کے اقربا اور خلفا میں بڑے بڑے اکابر موجود تھے مگر انہوں نے خواجہ سید محمد امام کی جگہ مجلس میں سب سے بالاتر رکھی تھی ۔ اور اپنے سامنے انکی بیعت لوگوں سے کراتے تھے اور پانچویں یہ کہ حضرت محبوب الٰہیؒ اپنی موجودگی م[illegible] اور صاحب سماع قرار دیتے تھے ۔ ایسے ہیں کہ ان سے ثابت ہوتا ہے [illegible] سید محمد امام ہی حضرت محبوب الٰہیؒ کے نسبی و روحانی اور ہر حیثیت سے سجادہ [illegible] تھے کیونکہ حضرت محبوب الٰہی کے کوئی اولاد نہ تھی ۔ آپ نے ساری عمر نکاح [illegible] تھا ۔ اور حضرت خواجہ سید محمد امام ہی ان کے فرزند معنوی اور فرزند حقیقی کے طو[illegible] جاتے تھے ۔

حسن نظامی بھی حضرت خواجہ سید محمد امام کی اولاد میں ہے ۔ اور یہی وجہ [illegible] اس درگاہ میں سکونت کی ہے ۔ کہ چھ سو برس سے اسکے بزرگ نسلاً بعد نسل یہ[illegible] رہے ۔ سیتھ ہیں ۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ مقیم رہینگے ۔

خواہرزادگی کا لفظ جو حسن نظامی کے نام کے ساتھ ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ [illegible] خواجہ سید محمد امامؒ کی اولاد کی قرابت حضرت محبوب الٰہیؒ کی خواہرزاد[illegible] اولادسے ہوتی ہی[illegible]

اب بھی ہوتی ہے۔

ان مستند اور معتبر حالات کی بنا پر درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی سجادگی کا حق اولاد
حضرت خواجہ سید محمد امام کا ہے۔ اور قیامت تک رہے گا۔ خدا کرے کہ یہ اولاد اصلی معنوں
میں فرائض سجادگی کو ادا کرنے کے قابل ہو اور اپنے جد کی طرح حقیقی فرزند حضرت محبوب الٰہی
کی بن جائے۔ آمین۔

یہاں مجھے اپنی آنے والی نسل سے یہ خطاب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ نسب کے
اس فخر اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی مقرر کردہ سجادگی اور امتیازات مخصوصی پر گھمنڈ نہ کرے
فرصت عمل کی ہے۔ کہ عمل ہی سے تمہارے دادا حضرت خواجہ سید محمد امام کو یہ درجہ
حاصل ہوا تھا جو حضرت محبوب الٰہیؒ کے نہ کسی خلیفہ کو حاصل ہوا نہ قرابت دار کو۔

حسن نظامی کی ولادت اور زندگی کا مجمل حال

تیرھویں صدی کے خاتمہ کے قریب سنہ ۱۲۹۶ ہجری میں ۲ محرم کو جمعرات کے
دن صبح صادق کے وقت حسن نظامی پیدا ہوا۔ اسکی رو سے آجکل کہ جمادی الاول سنہ ۱۳۳۷
میں اسکی عمر ۴۱ سال کی ہے۔

حسن نظامی نے ہوش سنبھال کر اپنے ایک بڑے بھائی سید حسن علی شاہ کو دیکھا
(جو سات برس ہوئے رحلت کر گئے) اور ایک بہن حسنیٰ بانو کو دیکھی تین برس ہوئے
انتقال کر گئیں)۔

تعلیم
حسن نظامی نے پہلے ناظرہ قرآن شریف پڑھا۔ پھر فارسی کی چند معمولی کتابیں۔
اسکے بعد عربی صرف و نحو شروع کی (انگریزی بالکل نہیں آتی۔ بڑی عمر میں
کوشش بہت کی مگر حاصل کچھ نہ ہوا)۔

ان کے استاد اول دلی سے حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم ساکن

کاندھلہ ضلع مظفر نگر تھے بعد دہلی کے شاہی خاندان کی ملازمت کے سبب یہاں درگاہ شریف کے قریب ساری عمر مقیم رہے۔ اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ اور اسی جگہ ان کا مزار بنا۔

حسن نظامی شرح تہذیب اور کنز الدقائق پڑھتا تھا بارہ سال کی عمر تھی کہ ایک ہی سال کے اندر اسکے والدین کا انتقال ہو گیا۔ اور اسکی پرورش اسکے بڑے بھائی مرحوم سید حسن علی شاہ نے کی۔ اور اسکی عربی تعلیم کے جاری رکھنے میں مددگار رہے۔

جلالین اور مشکوٰۃ شریف ختم کرنے اور سنن ابوداؤد و ترمذی شروع کرنے کے بعد حسن نظامی دہلی میں چلا گیا۔ اور وہاں اس نے مولوی وصیت علی صاحب مرحوم و مولوی عبد العلی صاحب محدث اور مولوی حکیم الدین صاحب پنجابی اور مولوی حکیم رضی الحسن صاحب ساکن کاندھلہ سے کچھ دنوں مختلف کتب کی تعلیم حاصل کی اور درگاہ کے قیام کے بعد جناب مولانا محمد اسمعیل صاحب کے ان کے بڑے صاحبزادے مولانا میاں محمد صاحب سے بھی مدتوں سبق لئے۔

اسکے بعد جناب مولانا محمد یحیٰی صاحب خلف جناب مولانا محمد اسمٰعیل صاحب ساکن کاندھلہ جو حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی کے شاگرد رشید تھے مجھکو گنگوہ لے گئے۔ اور وہاں میں نے ڈیڑھ سال قیام کیا۔

شادی گنگوہ سے واپسی کے بعد حسن نظامی کا نکاح اس کے مرحوم چچا سید شوق علی صاحب کی لڑکی حبیب بانو سے ہوا۔ اور اس نکاح کے بعد متواتر کئی سال نہایت عسرت و پریشان حالی میں گزرے۔ یہ ایام اخباری مضامین لکھنے مطالعہ کتب علمی مجالس کی شرکت۔ اور مختلف و بے اصول تجارتی جستجو میں بسر ہوئے۔

اگرچہ زندگی کا یہ دور معیشت کے لحاظ سے مصیبت کا زمانہ تھا تاہم اطاعت شعار بیوی اور دوست نواز احباب کی اعانت اور ذاتی محنت و تلاش کی بدولت حسن نظامی اہل درگاہ کے پیشہ گداگری سے علیحدہ ہو کر قائم رہ سکا۔ اگر بیوی بے صبر ہوتیں اور احباب

اُنکی ضرورتوں کی کفالت نہ کرتے۔ (جنہیں خان بہادر نواب محمد مزمل اللہ خان رئیس بھیکم پور علی گڈھ۔ اور مرحوم راجہ نوشاد علی خان تعلقہ دار لکھنؤ اور شیخ غلام محمد صاحب مرحوم مالک اخبار وکیل امرتسر اور سب سے زیادہ منشی نظام الدین صاحب تاجر کتب دہلی اور نواب خواجہ غلام نصیر الدین خان صاحب رئیس شیخ پورہ ضلع میرٹھ۔ اور شہزادہ میرزا امیر الملک صاحب دہلوی تھے) تو شاید بہت دشواریاں استقلال میں پیش آتیں۔

اس دور میں حسن نظامی نے اہل درگاہ کے مروجہ طرز معاش کو ترک کر دیا تھا۔ اور کسی ظاہری سہارے کے نہ ہونے کے سبب روٹی کا میسر آنا محال نظر آتا تھا۔

خدا مغفرت کرے حسن نظامی کی سابقہ زوجہ حبیب بانو کو جنہوں نے اس تنگی اور بھوک میں ستانے والے وقت میں اپنے شوہر کا نہایت رازداری کے ساتھ حق رفاقت ادا کیا۔

اسی زمانہ کے آخر میں خدا تعالیٰ نے غیبی مدد بھیجی اور ایک یورپین جنرل ڈکسن سے ملاقات ہوئی جو اسلام کے شیدا اور تصوف کے شیفتہ تھے۔ اور ہر سال لندن سے دہلی آتے تھے۔ جنرل ڈکسن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حسن نظامی کی وسعت رزق کا اسباب فرمایا۔ جنرل موصوف ہر سال کے شروع میں اتنی کثیر رقم دیتے تھے جس سے تمام برس کے اخراجات فراغت سے ہو جاتے تھے۔ اور حسن نظامی کو مشاغل علمی میں مصارف خانگی کا فکر و تردد نہ کرنا پڑتا تھا۔ جنرل ڈکسن پہلے شخص تھے جنہوں نے اسلامی و روحانی تعلق میں حسن نظامی کو اپنا پیر سمجھا تھا۔ اور حسن نظامی کو بھی پہلا تجربہ ایک انگریز کی اخلاص خلوص اور بے غرض دوست نوازی کا ہوا تھا۔ وہ وقت بھی عجیب تھا خلقت کہتی تھی کہ یہ انگریز کوئی جاسوس ہے۔ جو مہینوں دہلی آکر رہتا ہے۔ اور گھنٹوں حسن نظامی کے حجرہ میں تخلیہ رکھتا ہے۔ کوئی کہتا حسن نظامی کرسٹان ہو گیا۔ جو انگریز کے ساتھ کھاتا پیتا ہے کوئی کہتا۔ انگریزوں کی قوم بڑی چالاک ہے خبر نہیں یہ انگریز کس منصوبہ کو لیکر آیا ہے۔

اور کیونکر حجرہ کے کواڑ بند کرکے چپکے چپکے باتیں کیا کرتا ہے۔ مگر حسن نظامی کہہ سکتا ہے کہ جنرل ڈکسن کسی سیاسی غرض کے آدمی نہ تھے۔ انکو اسلام اور مسلمین کے ساتھ ایک عشق تھا۔ وہ صوفیوں کی روش کے عاشق زار تھے۔ انکو روحانی ریاضتوں اور سلوک تصوف کے اسرار معلوم کرنے کا شوق تھا۔ وہ اسلامی دنیا کے بہت بڑے سیاح تھے سوڈان کے محاربات میں انہوں نے بڑے بڑے کام کئے تھے۔ مصر کے مفتی محمد عبدہ سے انکی دوستی رہ چکی تھی۔ ہندوستان میں موجودہ مہاراجہ گوالیار، مہاراجہ بیکانیر و نواب صاحب رامپور ان کے دوست تھے۔ انکی عمر ساٹھ سے زیادہ تھی۔ وہ بڑے تجربہ کار اور جہاندیدہ انگریز تھے۔ اردو بولتے تھے۔ اور کچھ لکھ پڑھ بھی سکتے تھے۔

جنرل ڈکسن جنگ یورپ کے بعد پھر ہندوستان نہیں آئے۔ نہ انکا خط آیا تاہم سنا ہے کہ وہ زندہ ہیں (خدا ان کو زندہ رکھے) وہ انگریزی خصلت کا نمونہ تھے اگر ایسے ملنسار اور محبت شعار انگریز ہندوستان کی حکومت پر مقرر ہوا کریں تو موجودہ باہمی نفرت حاکم و محکوم میں کبھی پیدا نہ ہو۔ حسن نظامی ان کا ذکر اسواسطے لکھتا ہے کہ ان کے احسانات کو زندگی حاصل ہو اور انکی یاد حسن نظامی کے ذکر میں ہمیشہ سلامت رہے کہ وہ اور وشواد کے بھی فرشتہ تھے جنکو خدا نے حسن نظامی کی مدد کے لئے بھیجا تھا (فراغت کے زمانہ میں ایک روسی بھی حسن نظامی کا مرید ہوا تھا۔ اور حسن نظامی نے اسکو خرقہ دیا تھا۔) اپنے ملک میں جاکر اس نے لکھا کہ مجھکو اپنے پاس فقیر بنا کر رکھو اور تصوف کی تعلیم دو۔ مگر جنگ یورپ کے سبب مسٹر ہیلی چیف کمشنر دہلی نے مجھکو اجازت نہ دی اور میں اس روسی کو دہلی نہ بلا سکا۔

قصہ مختصر یہ چند سال ایسے تھے جن میں حسن نظامی نے اخباروں میں مضامین لکھے تمام قومی جلسوں کی سیر دیکھی۔ ترقی سلوک کے لئے مجاہدات کئے اور اپنے ایک مقصود اور طرز کال قائم کرنے پر مسلسل غور و خوض کی۔

نومبر ۱۹۱۸ء میں سید محمد ارتضیٰ صاحب عرف ملا واحدی نے حسن نظامی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور حلقہ نظام المشائخ اور رسالہ نظام المشائخ کی بنیاد انکی شرکت و امداد سے ڈالی گئی۔

یہ لکھنا رہ گیا کہ مذکورہ ایام میں حضرت مولانا پیر سید مہر علی شاہ صاحب نے حسن نظامی کو مرید کرنے کی اجازت دیدی تھی اور ریاست الور میں مولوی عمر دراز نظامی درگاہی شاہ کی بیعت کی ایک معقول جماعت نے حسن نظامی کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی۔ یہی نہیں بلکہ خطوط کے ذریعے سے لگاتار اور جوق جوق خلقت بیعت ہو رہی تھی۔

حلقہ نظام المشائخ قائم کرنے کے بعد مشکلات کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ گھر کے مخالف اسکو بچوں کا کھیل کہتے تھے۔ اور مذاق اڑاتے تھے۔ اور بات بھی یہی تھی کہ ابتدا میں حلقے کے ممبر اور کام کرنے والے عموماً نوعمر لوگ تھے۔

واحدی صاحب۔ مرزا یعقوب بیگ صاحب نامی ایم اے۔ سید وحید الرحمن صاحب عرفانی بی۔ اے۔ ضیاء الدین احمد صاحب برنی بی۔ اے۔ علاء الدین صاحب نصیری سجادہ نشین درگاہ حضرت چراغ دہلی صاحب۔ قاضی لطیف الدین صاحب پیرزادہ درگاہ حضرت قطب صاحب۔ وغیرہ نوعمر لوگ حلقے کے ابتدائی شرکا تھے۔ جن پر آوازہ کشی کی جاتی تھی۔

اسی زمانہ میں حسن نظامی پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اسکی صابرہ اہلیہ حبیب بانو نے انتقال کیا۔ اسکے لڑکے مرگئے اور اسکے خلاف درگاہ کی برادری نے ایک باضابطہ شورش برپا کی۔ روزانہ درگاہ میں آنے والوں کے سامنے حسن نظامی کی برائیاں بیان کی جاتی تھیں اور طرح طرح کے غلط بہتان اسکے ذمہ لگائے جاتے تھے۔ اس شورش نے یہاں تک ترقی کی کہ ایک دفعہ عرس کے موقع پر جبکہ ختم کی شرکت کے لیئے کئی ہزار آدمی مزار شریف کے سامنے جمع تھے ایک بھائی صاحب نے حسن نظامی کے خلاف نہایت خوفناک لکچر دیا۔ اور جو الزامات اس میں لگائے گئے انکی تائید و تصدیق خاص حسن نظامی کے قریبی کنبہ والوں نے کی۔

ایک طرف تو یہ کیا۔ اور دوسری طرف پولیس میں رپورٹ کی کہ حسن نظامی درگاہ میں فساد کرانے والا ہے۔ اس رپورٹ کی بنا پر پولیس نے حسن نظامی اور اسکی محدود جماعت کا محاصرہ کرلیا۔ عین اسی ہنگامہ کے وقت ایک دوسرے قرابت دار نے حسن نظامی کے سامنے آکر ایسی سخت و درشت گفتگو کی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ حرب و ضرب کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔

یہ بہت نازک وقت تھا۔ حسن نظامی کے دل کی نظریں خدا کی ذات کو دیکھ رہی تھیں کہ میرا کچھ گناہ نہیں ہے۔ اور بے خطا یہ یورش مجھ پر کی جاتی ہے۔ اور کوئی حمایتی دکھائی نہیں دیتا۔

اسی اثناء میں جناب میر جالب صاحب (موجودہ ایڈیٹر اخبار ہمدم) تشریف لائے۔ اور انہوں نے کہا کہ اگر آپ پسند کریں تو میں ان لکچرار صاحب کی تقریر کا تقریری جواب دوں۔ حسن نظامی نے کہا کہ کچھ ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو خدا جزائے خیر دے۔ ہم کو صبر کرنا چاہئے۔ مگر حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبر آبادی سے (جو آجکل دہلی میں مطب کرتے ہیں) نہ رہا گیا۔ اور انہوں نے وہیں مجمع لکچر میں جاکر مخالفوں کو جواب دیے۔ حسن نظامی کو اطلاع ہوئی تو اس نے حکیم صاحب کو واپس بلا لیا۔ اور کہا حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا ہے۔ کُشندہ کُشتندہ بود۔ جو برداشت کرلیتا ہے وہ مار ڈالتا ہے۔ یہ وقت ضبط اور برداشت کا ہے۔ میں اپنی قوم کا بدخواہ نہیں ہوں۔ خدا اسکو جانتا ہے۔ وہی میری حمایت کرے گا۔ اور ان شرارتوں سے بچائے گا۔ جب میرا کچھ قصور نہیں ہے اور میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ بعض خلاف شریعت مراسم کی اصلاح ہو۔ اور طوائفیں مزارات کے سامنے رقص نہ کریں۔ تو اس مخالفت کو بھی دور کرا دے گا جسکے حکم کی اطاعت میں مجھ پر یہ حملہ کیا گیا ہے۔

اس واقعہ کے بعد ایک محضر تیار کیا گیا جس میں حسن نظامی کو خلع حلقۂ اسلام اور خارج

از مشرب تصوف ثابت کیا گیا۔ اور درگاہ کے حقوق سے بھی اس کو محروم کرنے کی درپردہ سعی کی گئی تھی۔ اس محضر پر تمام خاندان یعنی باشندگان درگاہ شریف نے دستخط کئے تھے صرف ان چند آدمیوں نے اس فتوے سفاکی پر دستخط کرنے سے انکار کیا تھا۔ سید حسن علی شاہ صاحب برادر حقیقی حسن نظامی۔ سید محمد صادق صاحب برادر عم زاد و موجودہ خسر حسن نظامی سید صمصام الدین صاحب۔ سید واجد علی صاحب مرحوم۔ سید اکبر علی صاحب۔

اس کے بعد مشائخ و علماء و رؤساء دہلی سے بھی اس پر دستخط کرائے گئے اور حسن نظامی کو یاد رہے گا کہ اسکے دوست اور روشن خیال بزرگوں نے بھی اسپر دستخط کر دئے۔ مگر حضرت مولانا شاہ ابو الخیر صاحب نقشبندی سجادہ نشین خانقاہ نقشبندیہ اور حضرت مولانا محمد عمر صاحب اخوندجی قادری نے دستخط کرنے سے انکار کیا۔

دہلی میں ایک اخبار معارف بھی ان مخالفین کے ساتھ تھا جو میرے خلاف نہایت دل آزار مضامین شائع کرتے تھے۔ ان مشکلات کے ساتھ ساتھ بیماری نے بھی حملہ کیا۔ اور حسن نظامی کو نمونیہ ہو گیا۔ اسوقت حکیم محمود علی خان ماہر اکبر آبادی صاحب اور برادر سید محمد صادق صاحب نے حسن نظامی کی بہت خدمت کی اور شورش کی خبروں کو اس کے کان سے بچائے رکھا۔

بیماری کے بعد حسن نظامی کلکتہ گیا۔ اور لارڈ منٹو وائسرائے ہند تک اسکی رسائی ہوئی۔ اور وائسرائے نے اسکو گورنمنٹ ہوس میں مدعو کیا۔ یہ خبریں دہلی آئیں تو مخالفین کی آتش حسد بھڑکی۔ اور انکو اندیشہ ہوا کہ ہم کو درگاہ سے خارج کرنے کو حسن نظامی نے کوئی منصوبہ تیار کیا ہے۔

حکیم حاذق الملک بہادر دہلوی نے حسن نظامی سے بیان کیا کہ درگاہ کے چند بڑے آدمی ان کے پاس گئے۔ اور کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ حسن نظامی لاٹ صاحب سے یہ طلب کرے گا ہم سب کو درگاہ سے نکال دے اور خود مالک بن جائے۔ اور آپ اسکے مددگار ہیں

حکیم صاحب نے ان لوگوں کو مطمئن کیا۔ اور فرمایا حسن نظامی کی یہ نیت ہرگز نہیں ہے۔ وہ آپ لوگوں کا بدخواہ دشمن نہیں ہے بلکہ حامی ہے۔ آپ اس خیال کو دل میں نہ آنے دیجیے۔

ایک رشتہ دار صاحب نے مخالفت کو یہاں ختم نہ کیا اور وہ پیران کلیر شریف کے عرس میں گئے۔ اور تمام مشائخ کو مجبور کیا کہ حسن نظامی کے خلاف محضر پر دستخط کریں بعض نے کیے۔ بعض نے انکار کیا۔ چنانچہ بانسہ شریف کے سجادہ نشین حضرت غلام جیلانی شاہ صاحب اور حضرت مولانا پیر مہر علی شاہ صاحب نے دستخط کرنے سے انکار کیا۔

حسن نظامی کو معلوم ہے کہ سفر بنگالہ کے زمانہ میں جبکہ دہلی میں شدید شورش حسن نظامی کے خلاف تھی۔ واحدی صاحب۔ اور قاضی لطیف الدین صاحب پیرزادہ درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحب اور منشی غلام نظام الدین صاحب تاجر کتب برابر ایسی تدابیر میں مصروف رہے جن سے یہ شعلے فرو ہوں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جب مخالفین جلسہ مسلم لیگ دہلی کے پنڈالوں میں از سابقہ جلسہ لیگ دہلی جو ہزہائینس آغا خان کی صدارت میں ہوا تھا حسن نظامی کے خلاف اشتہارات تقسیم کرنے گئے تھے تو غلام نظام الدین قریشی بریلوی (جو خواجہ حسن نظامی کے مخلص مرید ہیں) اور انکی جماعت نے ان اشتہاریوں پر حملہ کیا اور ان کو مکان سے باہر نکالدیا۔

ضرورت نہ تھی کہ اتنی بڑی رام کہانی خواہ مخواہ یہاں بیان کی جاتی۔ مگر آیندہ نسلوں کی یادداشت خصوصاً اپنے بچوں کی معلومات کے لیے اس کا مختصر سا ذکر مناسب تھا۔ تاکہ وہ اپنے عمل کے وقت مخالفتوں سے گھبرایا نہ کریں۔ اور ان کو یاد رہے کہ استقلال اور ہمت ہر مخالفت کو جیت لیتی ہے۔ چنانچہ حسن نظامی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ کہ جو سب سے زیادہ شدید مخالف تھے (سوائے چند کے) وہ رفتہ رفتہ دوست بن گئے۔ اور ان کے عناد و حسد کی آگ دلوں میں دب گئی۔ گو اس کا بجھنا محال تھا۔ مگر حسن نظامی نے باوجود قدرت حاصل ہونے کے اپنے دشمنوں سے انتقام کی خواہش نہ کی۔ بلکہ حتی المقدور ان کے

ساتھ احسان کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

درگاہ والوں کو یہ خیال تھا کہ حسن نظامی کی شہرت و ترقی ہماری معاش کے لیے مضر ہوگی۔ اور حسن نظامی کے سامنے ہم کو کوئی نہ پوچھے گا۔ مگر جب انہوں نے دیکھ لیا کہ حسن نظامی ہماری آمدنی سے کچھ غرض نہیں رکھتا۔ اور اسکی روزی تجارت پر منحصر ہے تو وہ رفتہ رفتہ خاموش ہوتے گئے۔

عجیب واقعہ گو مگر بے موقع نہ ہوگا اگر ایک عجیب واقعہ کا ذکر بیان کیا جائے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک صاحب حسن نظامی اور حلقۃ المشائخ کے بڑے مخالفین میں تھے۔ اور کوئی اہم کام ان کے مشورہ کے بغیر ہوتا تھا۔ ایک دن وہ دہلی کی (جہاں اندنوں میرا قیام تھا) منزل گاہ حلقۃ المشائخ کے اندر آئے۔ اور روتے ہوئے آئے اور کہا کہ ان کو حضرت محبوب الٰہی رض نے خواب میں بشارت دی ہے کہ حسن نظامی میرا ہے۔ اسکی مخالفت نہ کرو (مفہوم یہ تھا۔ الفاظ یہ نہ تھے جو اسوقت یاد نہیں) اسواسطے میں تمہارے حلقہ کا ممبر بنتا ہوں۔ اور آئندہ مخالفت کرنے سے تائب ہوتا ہوں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ہاتھ سے یہ خواب لکھ دیا اور حلقہ کے ممبر بن گئے بلکہ اس خواب کو چھپوا کر تقسیم بھی کیا گیا تھا۔ مدت کی بات ہے۔ عبارت یاد نہیں رہی۔

مقصود کا تقرر ان تمام امتحانات و مشکلات کے بعد اللہ تعالیٰ نے حسن نظامی کے قلب کو ہدایت کی اور اس نے اپنی زندگی کا ایک مقصود قرار دے لیا۔ اور وہ یہ تھا کہ اسلامی تصوف کو نئے انداز اور جدید طرز میں لکھا جائے کہا جائے۔ برتا جائے۔

چنانچہ اس مقصود کے پیش نظر رکھنے کے ماتحت اس نے اپنا عمل شروع کیا۔ حلقہ نظام المشائخ کی غرضیں بھی اسی اصول پر قائم کی گئی تھیں جن میں ایک تصوف کی حفاظت و اشاعت۔ دوسری مشائخ صوفیہ کو مرکز اتحاد پر لانا۔ تیسری عرسوں و خانقاہوں کی

ان مراسم کی اصلاح جو دائرہ شریعت و طریقت سے خارج ہو گئی ہیں۔ چوتھی مشائخ کے سیاسی حقوق کی حفاظت۔

حلقہ کی پہلی غرض حفاظت و اشاعت تصوف پر عمل کرنے کے لیے رسالہ نظام المشائخ جاری کیا گیا۔ اگرچہ اس سے پہلے ایک صوفی پرچہ مولوی جمال الدین احمد صاحب علوی نے الاحسان کے نام سے جاری کیا تھا۔ جو علم ہم نہ ہونے کے سبب بند ہو گیا تھا۔ اور لکھنؤ سے مولوی عبد الحلیم صاحب شرر بھی ایک کوشش العرفان کے نام سے کر چکے تھے جو مقاصد اصلی کے پیش نظر نہ ہونے کے سبب جاری نہ رہ سکا تھا۔

نظام المشائخ نے وہ کام کیا کہ نہ صرف خود زندہ رہا۔ اور زندہ ہے۔ اور بہت کامیابی اور شان کے ساتھ موجود ہے۔ بلکہ اس نے ایک عام تحریک ملک میں اس قسم کے لٹریچر کی پیدا کر دی۔ چنانچہ پنجاب سے رسالہ صوفی و طریقت انوار الصوفیہ پھلواری سے رسالہ معارف۔ میرٹھ سے اسوۂ حسنہ وغیرہ پرچے اس مقصد اہم کی تکمیل کے لیے جاری ہو گئے۔ جو آجتک سوائے دو ایک کے جاری ہیں۔ یہ اثر پرچوں تک محدود نہ تھا۔ بلکہ متعدد نامہ نگار پیدا ہو گئے۔ جو صرف التصوف کے رنگ میں اصلاحی۔ تاریخی اور ادبی مضامین لکھنے لگے۔

خدا کے فضل سے نظام المشائخ کو آجتک کہ گیارہ برس سے زیادہ عرصہ اس کے اجرا کو ہو گیا کسی قسم کی مالی یا قانونی دشواری پیش نہیں آئی۔ اور اسکی اشاعت اکثر بلکہ تمام ماہوار اردو پرچوں سے بڑھی رہی۔ اور بڑھی ہوئی ہے۔

حلقہ کی غرض حفاظت کے ماتحت درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ میں ایک کتب خانہ قائم کیا گیا۔ جہاں آج بے شمار قلمی و نایاب کتب کا ذخیرہ موجود ہے۔

اصلاح مراسم کی کوششوں میں ایک اصلاح بہت زیادہ کامیاب ہوئی کہ

درگاہوں سے بازاری عورتوں کا ناچ گانا بند ہو گیا جسکی بدولت حسن نظامی نے بڑے بڑے مصائب برداشت کئے تھے۔ حسن نظامی نے پادشاہ دکن میر عثمان علی خان بہادر نظام الملک آصف جاہ سے بھی زبانی درخواست کی تھی کہ مملکت دکن کی خانقاہوں میں یہ بدعت بکثرت رائج ہے کہ وہاں فاحشہ عورتیں مزارات کے سامنے ناچی گاتی ہیں تو اعلیٰحضرت نے فوراً احکام جاری کرا دئے۔ اور اپنی تمام قلمرو میں حکم شدید کے ساتھ اس بدعت کو بند کرا دیا۔

باقی اغراض پر حکومت کے چند در چند شبہات کے سبب عمل نہ ہو سکا جو مسلسل چار سال قائم رہے۔ حکومت ہی کے شبہات نہ تھے بلکہ مشائخ بھی اس جدید طریقہ سے مانوس نہ ہوتے تھے۔ اور طرح طرح کی مشکلات حلقہ کے کام میں ڈالتے تھے۔

حکومت کے شکوک کا باعث یہ تھا کہ حسن نظامی نے ممالک اسلامیہ کا ایک طولانی سفر حلقہ کی اغراض کے ماتحت کیا تھا تاکہ بیرونی مشائخ اور خانقاہوں کے حالات سے آگاہی حاصل کرے۔ چنانچہ وہ ۱۹۱۱ء میں ممالک مصر۔ فلسطین۔ شام۔ حجاز کا ایک مفصل دورہ کر کے واپس آیا۔ اور بہت وسیع تجربے ساتھ لایا۔ جو ایسے تھے کہ اگر سلطنت رخنہ انداز نہ ہوتی تو ان سے بہت اچھے اور بڑے فائدے حاصل کئے جا سکتے تھے۔

حکومت کا شبہ بعض ترکوں کی ملاقات اور مصر کی آزاد جماعت کے پیشواؤں سے ملنا جلنا تھا۔ جو زمانہ سفر میں حسن نظامی کے لئے ایک لازمی امر تھا۔ کیونکہ وہ تصوف و اہل تصوف کی نسبت جدید جماعتوں کے خیالات معلوم کرنے چاہتا تھا۔

واپسی سفر کے بعد پولس کی زبردست نگرانی شروع ہو گئی۔ اور جنگ طرابلس و بلقان کے ایام نے اسکو اور بڑھا دیا۔ اور کا پنور کا واقعہ تو اس سوزش کیلئے سہاگہ ثابت ہوا۔ اور کوئی مرحلہ مشکلات و تکلیفات کا باقی نہ رہا جو حسن نظامی کے جسم۔ مال۔ اور روح کو نہ پہنچا ہو۔

اس انحراف نے حلقہ کے ان ماہواری اور ہفتہ وار جلسوں کو بھی بند کرادیا۔ جو لوگوں
میں ذوق تصوف پیدا کرتے اور بڑھاتے تھے۔ ایک اعتبار سے تو حلقہ کی ظاہری زندگی
اس آشوب نے بالکل ہی ختم کردی۔ مگر حسن نظامی کی تحریروں اور تقریروں نے حلقہ کی روح کو
دنیا سے جانے نہ دیا۔

غرض مختصر سنہ ۱۹۰۸ء سے لیکر سنہ ۱۹۱۴ء تک حسن نظامی کی زندگی مضامین
نویسی۔ تصنیف و تالیف کتب اور خدمت مریدین میں صرف ہوئی۔ اور ہر سال خدا تعالیٰ
کی عنایت سے اسکے کاموں کو ترقی ہوتی گئی۔ مریدوں کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی
تالیفات و تصنیفات چالیس سے زیادہ ہوگئیں۔ اور عقد ثانی کر لینے کے سبب انکی
خانگی زندگی میں بھی ایک اطمینان اور سکون پیدا ہو گیا۔

سنہ ۱۹۱۳ء میں حسن نظامی نے نظام المشائخ تمام و کمال واحدی صاحب کے سپرد کرکے
میرٹھ سے ایک اخبار توحید جاری کیا۔ جو ۵ مہینے زندہ رہ سکا۔ اور اس قلیل زمانہ میں
انکی ایسی شہرت ہوئی کہ ہندوستان میں کسی ہفتہ وار اردو اخبار کی نہ ہوئی ہوگی۔ اور ایسی
ہی اسکی اشاعت و مقبولیت کی وسعت تھی۔ آخر حکام سلطنت نے اسکو جبرًا ضبط کر لیا۔
اور حسن نظامی کو قیام میرٹھ ترک کرکے دہلی آنا پڑا۔

جنگ یورپ شروع ہونے کے بعد حسن نظامی نے ملک کے تعلیمی۔ مذہبی اور سیاسی
جلسوں میں شریک ہونا چھوڑ دیا اور سیر و سیاحت میں بھی کمی ہو گئی۔ کیونکہ پولیس کی پابندی
اتنی زیادہ تھیں کہ اسکو کسی جگہ امن اور چین نہ ملتا تھا۔ پولیس والے ریل میں ایک ڈاکو یا
خوفناک مجرم کی طرح ہر جنکشن پر تفتیش حال کرتے تھے۔ اور آدھی رات۔ پچھلی رات کی
نیند بھی انکی نذر ہوتی تھی کیونکہ اگر ان اوقات میں کوئی جنکشن آتا تھا تو پولیس آکر اس کو
جگاتی تھی اور پرسش احوال کرتی تھی۔ اسکے علاوہ جس شخص کے ہاں قیام کیا جاتا تھا
اس ناکردہ گناہ پر ستم آجاتا تھا۔ پولیس اسکو بھی ستانے سے باز نہ رہتی تھی۔

یہی وہ امتحان کا زمانہ تھا جس میں ہمت دبے کی آزمائی جاتی تھی۔ حسن نظامی کو جن دوستوں اور مریدوں کی جوانمردی پر اعتماد تھا وہ پولس کی یورش سے گھبرا جاتے تھے اور ایسے بزدل ہوتے تھے کہ حسن نظامی کو مجبوراً ان کے گھر سے نکلنا پڑتا تھا۔ اور جنکو وہ کمزور اور بزدل خیال کرتا تھا وہ دلیر اور بے پروا ثابت ہوتے تھے۔

حسن نظامی پسند نہیں کرتا کہ ان مقامات و اشخاص کے نام لکھے۔ کیونکہ اس سے ناظرین کو کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔

البتہ حضور نظام میر عثمان علی خان بہادر بادشاہ دکن کی شاہانہ ہمت کا ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ انہوں نے اور ان کے سابق مدار المہام مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر نے ایک موقع پر کمال استقلال سے حسن نظامی کے ساتھ برتاؤ کیا۔ جبکہ انگریزی پولس اور انگریزی حکام اعلیٰ (ریزیڈنٹ) کے بعض ناگفتہ بہ اشارات سے حسن نظامی کو بہت عجلت کے ساتھ حیدرآباد چھوڑنا پڑا اور وہ بمبئی چلا گیا تو بادشاہ دکن نے خود تار بھیجکر حسن نظامی کو راستے سے واپس بلا لیا اور کئی روز اپنا مہمان رکھا۔ اور اسکی پاسداری کی کہ حکام انگریزی کو حسن نظامی سے باغیانہ شکوک کا شکوہ ہے۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں آنریبل مسٹر بیلی چیف کمشنر دہلی۔ اور سر چارلس کلیولینڈ ڈائرکٹر جنرل خفیہ پولس۔ اور مسٹر اورڈ سپرنٹنڈنٹ خفیہ پولس دہلی کی مہربانی سے حسن نظامی کی بدگمانی دور کی گئی۔ اور اسوقت سے آجتک اب کسی قسم کی اذیت شک و شبہ کی پولس کے ہاتھوں سے اسکو نہیں ہے۔ سوائے اسکے کہ اب بعض عوام انگریزوں کے میل جول کے سبب حسن نظامی کو خفیہ پولس کا ملازم یا حکام سے سازش کنندہ یا انگریزوں کا خوشامدی تصور کرتے ہیں۔

اسی موقع پر یہ ذکر بھی دلچسپ ہوگا کہ سنہ ۱۹۱۱ء میں جب حسن نظامی ممالک اسلامیہ کی سیاحت کے لیے ہندوستان سے باہر گیا۔ اور بیت المقدس کے ...

سرقہ تبرکات پر اسکی رائے رو ٹر کمپنی سے بذریعہ تار ہندوستانی اخبارات میں شائع کرائی تو اخبار وطن لاہور اور پیسہ اخبار لاہور نے اس قسم کے مخالفانہ مضامین حسن نظامی کے خلاف لکھے کہ مسلمانوں کو شبہہ ہو گیا کہ حسن نظامی انگریزی جاسوس بنکر ان ملکوں میں گیا ہے۔ اور انگریزوں نے اپنے خرچ سے اسکو بھیجا ہے۔ یہ بدگمانی اتنی بڑھ گئی تھی کہ دہلوی صاحب کو میرے سفر کے ایام میں باقاعدہ اسکی تردید شائع کرنی پڑی۔ تب بھی بدظنی دور نہ ہوئی۔ اور جب ہندوستان واپس آکر پولیس کی یورش حسن نظامی پر عام طور سے دیکھی گئی۔ اسوقت خیالات بدلے۔

خدا کی شان ہے کہ وطن اور پیسہ اخبار نے ایک جھوٹی بدگمانی پھیلانے کا خمیازہ بہت جلدی بھگت لیا۔ اور وہ دونوں اپنے اس مسلط اعتبار سے جو مسلمانوں کا ان پر تھا گر گئے۔ یہاں تک کہ اب مسلمان ان اخباروں کا نام لینے سے نفرت کرتے ہیں۔ پڑھنا اور خریدنا تو امر دیگر ہے۔

وطن تو بالکل پردہ گمنامی میں چھپ گیا۔ پیسہ اخبار کہیں کہیں دیکھا جاتا ہے اور حکام کی عنایت کے سبب اسکی رسائی اونچی اونچی جگہوں تک ہو جاتی ہے۔ تاہم پبلک کی نظر میں اسکی ایک ذرہ کے برابر بھی وقعت نہیں ہے۔

مگر حسن نظامی آج بھی بدگمان نہیں ہے۔ اور ان بدگمان اخباروں کو قومی خادم اور ایک خاص قسم کا کام آنے والا خدمت گذار قوم تصور کرتا ہے۔ اور ان کے ایڈیٹروں کی دوستی اور ذاتی ملاقات پر اسکو مسرت ہے۔

یہ سرسری اور مجمل بیان حسن نظامی کی زندگی کا تھا۔ اب زندگی کے جزئی واقعات کا فرداً فرداً ذکر کر کے ان سے مفید عوام نتائج نکالکر دکھائے جاتے ہیں۔ تاکہ پیر بھائیوں کو ان سے سبق حاصل ہو۔ اور وہ سوانح عمری کے ان حصوں سے بہرہ مند ہوں جو خود ان کی زندگی کو بھی پیش آتے ہیں۔ اور بے خبری میں ان سے کچھ حاصل نہیں کیا جاتا۔

حیاتِ حسن نظامی کے تجربات

پہلا دور بچپن حسن نظامی پیدا ہوا تو اسکے والدین نے قاسم علی نام رکھا۔ مگر اسکے ماموں سید بہادر علی شاہ صاحب علی حسن کہہ کر پکارتے تھے آخر یہی نام قرار پا گیا۔ جو تیس برس تک کی عمر تک رہا۔ اور اسکے بعد حسن نظامی ہو گیا۔ ابتدائی زمانہ میں اخباروں کے مضامین سید محمد علی حسن نظامی کے نام سے شائع ہوتے تھے حسن نظامی کے نام سے سب سے پہلا مضمون حالت زاغ کے عنوان سے اخبار وکیل امرتسر میں شائع ہوا اور یہ مخفف نام دیکھ کر حسن نظامی کے ایک قرابت دار نے بہت مذاق اڑایا۔ کیونکہ جس طرح حسن نظامی کو ہر کام اور ہر بات میں جدت کا خیال رہتا تھا۔ اسی طرح میرے ان ہم سبق رشتہ دار کو جو کئی سال تک میرے رفیق تعلیم رہے تھے۔ ان جدتوں پر نکتہ چینی اور مضحکہ کرنے کا شوق تھا۔

ان بدذوقوں اور مخالفتوں کے زمانہ میں جن کا مجمل تذکرہ اوپر آیا ہے۔ میری قوم اور کنبہ دار علی حسن نام پر بہت زور دیتے تھے۔ یعنی ہر تقریر اور تحریر میں علی حسن عرف حسن نظامی کہا جاتا اور لکھا جاتا تھا۔ ان لوگوں کو غلط فہمی یہ تھی کہ حسن نظامی کے عروج ترقی کا باعث یہ نئی قسم کا نام ہے۔ اگر ہم اس کا قدیمی اور اصلی نام بکثرت شائع کرینگے تو اسکا بڑھنا رک جائے گا۔ اور پھر اسکو کوئی شخص کوڑی کو بھی نہ پوچھے گا۔ مگر آج ان کو یہ پڑھ کر تعجب ہوگا کہ حسن نظامی نے خود اپنا اصلی نام لکھنے اور علی الاعلان ظاہر کرنے میں تامل نہ کیا۔ اس کتاب کی تحریر کے وقت تک کنبہ کے دشمنوں کو یہی وہم ہے کہ میری ترقی کا راز حسن نظامی نام میں ہے۔ اسواسطے وہ شد و مد سے علی حسن نام کا ذکر ہر اجنبی آدمی سے کرتے ہیں۔ لہذا میں بھی ان کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں ہی حسن ہوں میں علی حسن ہوں) مگر حسن نظامی کے حافظہ کی یہ حالت ہے کہ اپنے بچوں کے

نام بھول جاتا ہے اور کئی کئی منٹ سوچنے کے بعد ان کا نام یاد آتا ہے۔ لیکن بچپن کے واقعات کی یادداشت اتنی محفوظ ہے کہ ڈیڑھ ڈھائی برس کی عمر کے حالات ایسے یاد ہیں۔ گویا ابھی پیش آئے ہیں۔

اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں والدہ سے کچھ دیر کے لیے الگ ہوتا تھا یا کسی قسم کا خلاف مزاج واقعہ پیش آتا تھا تو میرے کلیجہ پر ایک بوجھ سا پیدا ہوتا رہتا۔ اور وہ بوجھ آہستہ آہستہ میرے اندرونی جسم کو ٹکر دیتا اور میٹھی میٹھی سوئیاں چبھوتا ہوا آنکھوں کی طرف امنڈ کر آتا تھا جس سے خود بخود میرا چہرہ روہانسا ہو جاتا تھا۔ منہ چڑھ جاتا تھا۔ ہچکی کی آواز حلق سے نکلنے لگتی۔ آنکھوں سے آنسو اور ناک سے رینٹ بہنی شروع ہو جاتی۔ رونے کی اس اندرونی کیفیت کا مجھے اتنا صحیح حس موجود ہے کہ اب جب میں اپنے بچوں کو یا کسی دوسرے کے شیرخوار بچوں کو روتا ہوا دیکھتا ہوں تو شیرخوارگی کا ہو بہو رونا یاد آ جاتا ہے۔ اور میں سمجھ لیتا ہوں کہ رونا کیونکر آتا ہے اور رونے میں کیا حالت دل کی اور اندرونی جسم کی ہوتی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شیرخوارگی کے زمانہ میں والدہ کی محبت اور ان کی عظمت کا احساس اتنا ہی زیادہ رہا جتنا کہ آج اکتالیس برس کی عمر میں ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ اس وقت کے سوچنے اور آجکل کے سوچنے میں بہت فرق ہے۔ شیرخوارگی میں وجوہات کا تصور نہیں ہوتا تھا کہ والدہ مجھے کیوں محبت کرتی ہیں۔ اور باپ بہن بھائی وغیرہ سے زیادہ ان کو میرے ساتھ کیوں تعلق ہے۔ اور آج میں ان وجوہات کو سوچ کر ماں کی محبت کا اندازہ کرتا ہوں۔ تاہم محبت کے اثر کا محسوس کرنا ہر زمانہ میں یکساں رہا۔ شیرخوارگی کے ابتدائی ایام میں میں اپنے والد کو بھائی کو بہن کو اور سینہ بہلانے والی نانی کو اچھی طرح پہچانتا تھا لیکن والدہ سے زیادہ کوئی شخص مجھ کو عزیز نظر آتا تھا۔ اور کسی ذات سے مجھے وہ ہمدر

نکلتی ہوئی معلوم نہ ہوتی تھی جو والدہ کی آنکھوں سے مجھ تک آتی تھی۔ اور ماں کے ہاتھوں اور گود میں محسوس ہوتی تھی۔ آج میں محسوس کرتا ہوں کہ دنیا میں سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ انسان سوائے خدا کے کسی کا تابعدار نہ ہو۔ اور اسکو اپنی آزادی کے اوپر پورا اختیار حاصل ہو لیکن ڈھائی برس کی عمر میں میرا حس یہ تھا کہ میری والدہ میرے ساتھ رہیں اور میں ان کے پہلو میں لیٹا ہوا چاند کو دیکھا کروں۔

اس تحریر کا نتیجہ یہ ہے کہ جن میرے بھائیوں کے والدین یا والدہ زندہ ہوں وہ انکی قدر و عظمت اپنے دلمیں جمائیں۔ اور یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے والدین خصوصاً والدہ سے بڑھ کر رشتوں اور تعلقات کی دنیا میں کوئی چیز نہیں بنائی۔

مجھے یاد ہے میری عمر تین سال کی تھی جب میں بیمار ہوا۔ اور حالت مرنیکے قریب ہو گئی۔ اسوقت درگاہ شریف میں بہادر شاہ بادشاہ کے کوئی قریبی قرابت دار بحالت درویشی رہتے تھے۔ والدہ نے مجھ کو ان کے پاس بھیجا انہوں نے کچھ پڑھ کر دم کیا اور چاندی کا ایک پترا منگا کر اپنے ہاتھ سے اسپر کوئی نقش کندہ کیا جب یہ نقش میرے گلے میں ڈالا گیا۔ تو والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ یہ تاویذ ہے۔ اور ہندوستان کے بادشاہ نے تمہارے لئے بنائی ہے۔ ہندوستان کے بادشاہ کہنے سے والدہ صاحبہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ تو میں نے پوچھا اماں تم کیوں روتی ہو۔ انہوں نے فرمایا۔ بیٹا اب یہ بادشاہ نہیں رہے۔ جنہوں نے تمکو تاویذ دی ہے انکی بادشاہی انگریزوں نے چھین لی۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے بادشاہ اور انگریزوں کا نام سُنا۔ میرا خیال ہے کہ دل میں تیموریہ خاندان کی محبت کا یہ پہلا تخم تھا جو والدہ صاحبہ نے بویا۔

اس واقعہ سے میرے بھائی یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر انکی عورتیں چھوٹے بچوں کے سامنے دین اور ایمان کی اور دنیاوی حوصلہ مندیوں کی اچھی اچھی باتیں بیان کیا کریں تو بچے ان کو

کبھی نہیں بھولیں گے۔ اور شروع ہی سے ان کی ایک پختہ ایمانی خصلت تیار ہو جائے گی۔

چار برس سے کچھ کم عمر تھی دروازہ پر ایک بھکاری فقیر کو میں آٹا دینے کے لئے گیا۔ اس فقیر نے میرے گلے میں سے نقرئی ناد علی اتارنی چاہی مگر میں نے مزاحمت کی اور اُسکے ہاتھ میں کاٹ کھایا فقیر نے میرا منہ مسل دیا اور گلا گھونٹنے لگا اسی اثنا میں کوئی عزیز آگئے اور انہوں نے مجھکو فقیر کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ پھر تو یاد نہیں کہ میرے گھر والوں نے اس فقیر کے ساتھ کیا سلوک کیا لیکن یہ بات ابتک دلپذیر بھی ہوئی ہے کہ ہٹے کٹے اور موٹے تازے گداگر عموماً جرائم پیشہ ہوتے ہیں اس واقعہ کا اثر ہے جو بچپن میں پیش آیا تھا کہ میں ہمیشہ ان گداگروں سے سخت نفرت اور عداوت رکھتا ہوں۔ قرآن شریف کا حکم وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (اور مانگنے والے کو مت جھڑکو) میری آتش انتقام کو ٹھنڈا کرتا رہتا تو معلوم نہیں کہ عہد طفلی کی یہ یادداشت مجھے کیسا سنگدل بنا دیتی۔

اس سے بھی میرے بھائی بچپن کی اس قوت کا اندازہ کرینگے۔ جو ہر قسم کا اچھا برا اثر مضبوطی سے قبول کر لیتی ہے +

میں پانچ برس کا تھا ننگے پاؤں گلیوں میں کھیلتا پھرتا تھا ایک ہاتھ میں سر کنڈے ایک ہاتھ میں ٹھیکرے لئے ہوئے اُچھلتا کودتا۔ چیختا۔ چلاتا۔ شام کے وقت گھر میں آیا۔ دیکھا والدہ صاحبہ نے کوری مٹی سے زمین لیپی ہے۔ اسپر سفید فرش بچھایا ہے لوبان جل رہا ہے۔ طباق میں حلوا بھرا ہوا رکھا ہے۔ اور وہ کسی انتظار میں بیٹھی ہیں۔ میں نے حلوے کو دیکھتے ہی ٹھیکرے اور سر کنڈے ہاتھوں سے پھینکدیئے۔ اور مٹی میں بھرے ہوئے ننگے پاؤں سے اُجلے فرش پر دوڑتا ہوا چلا گیا۔ اور بغیر پوچھے گچھے حلوے کے طباق میں ہاتھ ڈالدیا۔ یہ دیکھتے ہی والدہ صاحبہ بہت گھبرا کر اور ناراض ہو کر چلائیں۔ ارے ٹھیر ٹھیر کیا کرتا ہے

یہ پیر پیغمبروں کی نیاز کی چیز ہے - انہیں گندے منہ سے ہاتھ نہیں ڈالا کرتے اور نہ بیٹھے پاؤں لے کر اس پاک چیز کو چھونے پر آتے ہیں - ابا آتے ہونگے وہ آ کر نیاز دینگے جب نیاز ہو جائے گی - تب ہم تمہارے ہاتھ دھلا دینگے اسوقت کھانا ہ

مجھے یاد ہے پیر پیغمبروں کا نام سنکر میں لرز گیا - اور ان ناموں کا ایسا خوف مجھ پر طاری ہوا کہ میں نے ڈرتے ڈرتے ان سے پوچھا کہ پیر پیغمبر کیا ہوتے ہیں - والدہ کو اس سوال پر ہنسی آگئی - اور انہوں نے فرمایا کہ وہ خدا کے پیارے بندے ہوتے ہیں انکا ادب کرنا اور انکی نیاز کی چیز کا ادب کرنا بہت ضروری بات ہے - اس واقعہ کا اثر مجھ پر اتنا ہوا کہ عربی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اولیاء اللہ کی کچھ بے وقعتی میرے دل میں ہو گئی تھی - لیکن اس زمانہ میں بھی جب اس حلوے اور پیر پیغمبر کی نیاز کا قصہ مجھ کو یاد آتا تھا تو علمی فلسفے ذہن سے کافور ہو جاتے تھے - اور پیر پیغمبر کی غیر معمولی عظمت محسوس ہونے لگتی تھی -

اگر پیر بھائی اور انکی عورتیں عہد طفلی سے بزرگان دین کا ادب سکھائیں تو نتیجے بعد کی ترغیبات سے کبھی متاثر نہ ہوں ؛

میں چھ برس کا تھا اماں نے مجھے دو پیسے دئے ان میں ایک شیر کا تھا اور ایک ملکہ کی صورت کا - میں نے پوچھا کہ اماں یہ صورت کس کی ہے انہوں نے فرمایا ملکہ وکٹوریہ کی جو آجکل ہندوستان کی بادشاہ ہے اور یہ شیر کا پیسہ اس زمانہ کا ہے جب انگریزوں کی کمپنی کا راج تھا - میں نے کہا اماں میری صورت کا پیسہ بھی بنوا دو - ان کا دل چونکہ اسلامی حکومت کے انقلاب کے سبب بہت دکھا ہوا تھا میری درخواست سنکر رونے لگیں - اور بولیں کہ بیٹا مسلمانوں کی بادشاہت ہوتی ہے تو وہ کمہ کا دھیلہ پیسہ بنا لیتے ہیں - صورت بنانی ان کے ہاں حرام ہے - خدا تم کو بادشاہ بنا دیگا - تو کلمہ کا دھیلہ پیسہ چلانا - یہ صورت تو شیطان کی چیز ہے

سے امام اللہ کا بیٹا ہے اور کلمہ میں اللہ کا نام ہے۔

کلمہ اور اللہ کے نام اور بادشاہ بننے کا خیال اسی دن سے دل میں سما گیا۔

پیر بھائیوں اور پیر بہنوں کو لازم ہے کہ وہ بھی اپنے بچوں کے سامنے اسی قسم کی دینی اور دنیاوی باتیں کیا کریں۔ جن سے ان کے دماغ میں بڑے بڑے ارادے پیدا ہوں۔

میں سات برس کا تھا

دیکھا طاق میں چوڑیاں رکھی ہیں۔ میں نے چند چوڑیاں اتار کر ہاتھوں میں پہن لیں۔ والدہ نے دیکھا تو خفا ہوئیں اور فرمایا۔ اُتار چوڑیاں۔ نہیں تو امام مہدی کے ساتھ جہاد کرنے میں تلوار نہیں اٹھ سکے گی۔ میں نے فوراً چوڑیاں اتار ڈالیں۔ اور اماں سے پوچھا۔ امام مہدی کون ہیں۔ اور جہاد کیا چیز ہے۔ فرمایا آخر زمانہ میں امام مہدی ظاہر ہونگے۔ اور مسلمانوں کے دشمنوں سے لڑینگے۔ اسوقت ہر مسلمان ان کے ساتھ ہو کر تلوار اٹھا کر جہاد کرے گا۔ جہاد دین کی لڑائی کو کہتے ہیں۔

اس واقعہ کے بعد مجھکو چوڑیوں سے اس قدر عداوت ہو گئی کہ جس کی چوڑیاں دیکھتا ان کو توڑنے کو دوڑتا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ چوڑیاں بہت بری چیز ہوتی ہیں۔ ان کے سبب آدمی امام مہدی کے ساتھ جہاد نہیں کر سکتا۔ امام مہدی سے تعلق بھی اسی عمر سے پیدا ہوا۔ جب اور قسم کا تعلق تھا۔ اب اسکی اور کیفیت ہو۔ مگر تعلق جب بھی تھا اب بھی ہے۔

پیر بہنوں کو اس واقعہ سے سبق لینا چاہیئے۔ اس سے زیادہ لکھنا مناسب نہیں۔

مکتب میں

داخل ہونے کے وقت میری عمر پانچ برس کی تھی۔ سات برس کی عمر میں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں بڑا آدمی ہوں اور تیموری شہزادوں کے بچوں کی امداد حاصل کر کے (جو میرے ساتھ مکتب میں پڑھتے تھے) میواتیوں، قصائیوں اور بڑھیلوں کے لڑکوں پر حکومت کرنے کے سامان مہیا کرتا تھا۔ جو لڑکا میری اطاعت سے انحراف کرتا مکتب سے باہر نکل کر دوسرے لڑکوں سے اسکو پٹواتا تھا۔ یہاں تک کہ سب لڑکے

مجھ سے ڈرنے لگے تھے اور مجبوراً میرے اشاروں پر چلتے تھے۔

ایک دفعہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو میرے ان مظالم کی اطلاع ہو گئی اور انہوں نے
مجھ کو بہت تنبیہ کی۔ میں نے اپنے جاسوسوں سے پوچھا کہ کس نے میری
چغلی کھائی تھی تو معلوم ہوا کہ عرب سرائے کے ایک دولت مند میواتی معاملہ خان ٹھیکہ والے کے
لڑکے ابراہیم کا یہ کام تھا یہ سنکر آسانی سے ہمت نہ ہوتی کہ میں ابراہیم کو سزا دیتا کیونکہ اسکے
ساتھ بھی لڑکوں کا ایک جتھا تھا۔ اسواسطے میں نے کئی دن تک خاموشی اور صبر سے اسکو سوچا
اور آخر ذہن نے تجویز کیا کہ شہزادوں کے لڑکوں سے کام لینا چاہیئے۔ چنانچہ مرزا کالے مرزا
سنمدا وغیرہ لڑکوں کو لیکر مرزا غالب کے مقبرہ میں گیا۔ اور انکی لوح کے اوپر بیٹھ کر میں نے
ان شہزادوں کے سامنے ایک تقریر کی۔ اور ان سے کہا کہ تم شہزادے ہو اور ہم پیرزادے
ہیں۔ اس میواتی نے آج میری چغلی کھائی ہے کل تمہارے ساتھ یہی ہوگا۔ اس سے بدلہ
لینا چاہیئے۔ مرزا سنمدا نے کہا ابراہیم میرے ہاں کبوتر دیکھنے آیا کرتا ہے۔ میں اُس کو
وہاں نہیں آنے دونگا۔ مرزا کالے بولے میں مرغ بازی کا تماشا جو میرے گھر میں ہوتی
ہے اسکو نہیں دیکھنے دونگا۔ میں نے کہا یہ بھی کرو۔ اور یہ بھی کہ ابراہیم کے ساتھی لڑکوں
سے یارانہ کیا جائے۔ میں اپنے گھر سے چنے اور کشمش ناشتہ کے لیے لاتا ہوں۔ اسمیں سے
ان لڑکوں کو دیا کرونگا۔ اور تم بھی گھر سے لاکر ان کو کھلایا پلایا کرو۔ جب سب لڑکے
ہمارے دوست بن جائینگے۔ تو ابراہیم اکیلا رہ جائے گا۔ اور ہم سب ملکر اسکو خوب
مارینگے۔ ان دونوں نے اس رائے کو قبول کیا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ میواتی لڑکوں نے
ہماری چغلی کھائی بھی۔ اور لڑائی کے وقت ابراہیم کے ساتھ ہو گئے۔ تب بھی ہماری
جماعت اتنی زیادہ تھی کہ عرب سرائے کے سامنے نہر کے کنارے ابراہیم اور اس کے
ساتھیوں کو مار مار کر بھگا دیا۔ اسکے بعد ابراہیم ہمارا دوست بن گیا اور ایسا دوست کہ آج
اس مرحوم کے یاد کرنے سے بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آتے ہیں۔ اور دل بیتاب ہے۔

کبھی تانگہ چلانے والا اُسکا چھوٹا بھائی بن جاتا ہے تو میں اُسکا تانگہ کرایہ پر لیتا ہوں اور دوسروں سے سوایا کرایہ اسکو دیتا ہوں۔

اس واقعہ میں پیر بھائی کیلئے مجھ کو کوئی نتیجہ نظر نہ آیا۔ سوائے اسکے کہ بچپن کی دلچسپ خصلتوں کا حال انہوں نے سنا۔

اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے مکتب کے سب لڑکوں کو استنجے کے لیے ڈھیلے لانے کے واسطے جنگل بھیجا۔ میراثی لڑکے کھود دیتے تھے اور ہم اٹھا اٹھا کر لاتے تھے۔ یکایک میری نگاہ ایک ٹوٹی ہوئی قبر پر گئی جسکا پاٹ کھل گیا تھا اور اس میں ایک کھوپڑی اور پنڈلی اور گھٹنے کی ہڈیاں پڑی نظر آتی تھیں یہ منظر دیکھ کر میں ڈر گیا اور ایسا ڈرا کہ بخار چڑھ آیا۔ واپس آکر میں نے مولوی صاحب سے یہ قصہ بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا جو بچے اپنے ہم مکتبوں کو ستاتے ہیں۔ ان کا حال قبر میں جاکر یہی ہوتا ہے۔

یہ واقعہ سنکر مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ اسکے بعد پھر میں نے کبھی ہم مکتب لڑکے کو نہیں ستایا۔ اور برسوں قبر کا خیال مجھکو ڈراتا رہا۔ اور اب بھی وہ منظر جب سامنے آجاتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

پیر بھائی جی اگر بچوں کو نیک بنانے کے لیے اس قسم کی نصیحتیں کیا کریں۔ تو بہت اچھا نتیجہ پیدا ہو۔ مگر یہ خیال رہے کہ زیادہ خوفناک قصے بیان کرنے فائدہ کے بجائے نقصان دیتے ہیں۔ کیونکہ اس سے بچے ڈرپوک اور بزدل بن جاتے ہیں۔

میرے والد صرف حافظ قرآن تھے۔ اردو لکھنا پڑھنا ان کو نہ آتا تھا۔ ایک دفعہ میرے بھائی باہر سفر میں گئے ہوئے تھے۔ ان کا خط آیا تو والد نے ایک ایسے شخص سے پڑھوایا جو ہمارے خاندان کے پرانے دشمن تھے۔ ضرورت کے سبب پڑھوا تو لیا مگر والد کو اسکا بہت رنج ہوا میں مکتب سے واپس آیا اور ان کو مغموم دیکھکر

خوبیچ معلوم صورت بناکر پاس بیٹھ گیا۔ اسوقت میری عمر آٹھ برس کی تھی۔ والد کو میری یہ بات
شاید اچھی معلوم ہوئی ہوگی۔ وہ مسکرانے لگے۔ اور فرمایا تم جلدی جلدی پڑھو تاکہ ہم خط
لکھوانے اور پڑھوانے میں کسی کے محتاج نہ رہیں۔ دیکھو ہم نے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا تو اسکا
یہ خمیازہ اٹھایا کہ آج اپنے بڑوں کے پرانے دشمن کو تمہارے بھائی کا خط دکھانا پڑا۔
میں نے پوچھا ابا وہ دشمن کون ہیں۔ تو والد نے انکا نام بتا دیا۔ اور پھر ان کے تمام خاندان
کے آدمیوں کے نام لیئے۔ اور فرمایا کہ یہ لوگ اور ان کے بڑے مدتوں سے ہمارے اور
ہمارے بڑوں کے دشمن ہیں۔ ان کے پاس روپیہ ہم سے زیادہ ہے اور آدمی بھی ہم سے
زیادہ ہیں۔ مگر ہم اور ہمارے بڑے ہمیشہ ان پر زبردست رہے ہیں۔ میں نے کہا ہمارے
مولوی صاحب کہتے ہیں کسی سے کینہ اور دشمنی رکھنا گناہ ہے۔ والد نے فرمایا کہ مولوی صاحب
سچ کہتے ہیں لیکن جب دوسرا آدمی خواہ مخواہ عداوت اور نقصان پہنچانے پر آمادہ ہو
تو اس سے دبنا اور کلہ بکلہ جواب نہ دینا بھی گناہ ہے۔ ہمارے بڑے بہادر تھے اور
بہادر کبھی کسی سے دبکر نہیں رہتے۔

یہ تقریر سنکر مجھ پر دو اثر ہوئے ایک تو یہ کہ پہلے سے زیادہ مجھے لکھنے پڑھنے کا شوق
ہو گیا۔ اور دوسرے یہ کہ جن جن لوگوں کا ابا نے نام بتایا تھا۔ ان سب کی دشمنی کا خیال
میرے دل میں نقش کالحجر کی طرح رہنے لگا۔

اس موقع پر میرے بھائیوں کے سامنے مجھے صاف صاف باتیں کرنیکی ضرورت ہے۔
مجھے بتانا چاہیئے کہ حسد و کینہ اور عداوت بہت بری چیز ہے۔ والد مرحوم نے مجھے جو کچھ
نصیحت کی وہ خاندانی روایات کا ایک ورثہ تھا۔ جو انہوں نے مجھ تک پہنچایا۔ اسوقت
میرے قرآن میں اسکے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ اگر انسان خود کسی کے ساتھ دشمنی کا جذبہ
دل میں نہ رکھے اور عداوت سے دشمن پر وار نہ کرے اور صرف دشمن کے حملوں سے بچنے
کی مشق کرتا رہے تو ایک دن وہ دشمن خود بخود دوست بن جاتے ہیں اسمیں [illegible]

یہ ہے جو جنگ یورپ اور بڑی بڑی قوموں کی باہمی عداوتوں کے تجربے سے پیدا ہوا ہے کہ عداوت انسان کو مضبوط کرتی ہے۔ چوکنا اور ہوشیار رکھتی ہے۔ مضبوط ہونے۔ ترقی کرنے اور شاندار بننے کی ہمت و جرأت پیدا کرتی ہے۔ جس قوم کے افراد میں کسی دوسری قوم سے عداوت نہ ہو اسکی ترقی کا جوہر فنا ہو جاتا ہے اور وہ مختصر ہو جاتی ہے۔

بیشک جنگ یورپ نے یہ سبق پڑھایا کہ تقدیر اور اسکا خالق خدا ہم انسانوں کے کاموں میں پورا اختیار و اقتدار رکھتے ہیں۔ اور خدا کی مرضی کے بغیر کوئی طاقت کچھ نہیں کر سکتی جیسا کہ ہم نے دیکھا۔ اور دیکھیں گے۔ کہ بڑی بڑی طاقت وار اور ناقابل شکست ڈھیر مغلوب و مفتوح ہو گئیں تاہم میں خیال کرتا ہوں کہ نتیجوں کا ظہور ابھی باقی ہے۔ اور وہی قوم آخر کو کامیاب ہو گی جس کا بھروسہ خدا پر ہے اور حریف کی عداوت میں اسکے تمام قوائے جسمانی شریک و متحد و لبریز و سرشار ہیں۔

میرے والد نے جن خاندانی دشمنوں کا ذکر کیا۔ وہ ہمارے کنبہ کے لیے بنی امیہ کی سی مثال رکھتے ہیں۔ کہ بنی ہاشم سے ان کا جتھا بھی زیادہ ہے۔ انکی عقلیں اور تدبیریں بھی تیز ہیں اور دولت بھی ہمارے خاندان سے بہت زیادہ ان کے پاس ہے۔ اگر ہمارے بزرگ عداوت کا حس ہم میں پیدا نہ کرتے تو ہم حریفوں کی حکمت عملیوں سے غافل ہو جاتے اور وہ حسب فلسفہ تنازع للبقا ایک دن ہم کو اسی طرح نیست و نابود کر دیتے۔ جس طرح کہ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہیں اور بڑے کیڑے چھوٹے کیڑوں کو چٹ کر جاتے ہیں اور بڑے درخت چھوٹے پودوں کو اپنے سایہ میں پنپنے نہیں دیتے۔

حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد سے یہ عداوت شروع ہو گئی تھی۔ حضرت محبوب الٰہی رح کے بعض قرابت داروں کو گوارا نہ تھا کہ حضرت محبوب الٰہی خواجہ سید محمد امام و خواجہ سید موسیٰ فرزندان حضرت مولانا سید بدرالدین اسحٰق سے ایسی محبت و یگانگت کا برتاؤ کریں۔ اور ان کو اتنا امتیاز دیں کہ مجلس کی نشست میں حضرت

محبوب الٰہیؒ کے بعد خواجہ سید محمد امام سے کسی کو فوقیت نہ ہو۔ اور حضرت محبوب الٰہیؒ اپنی موجودگی
میں خواجہ سید محمد امام کا لوگوں کو مرید کرائیں۔ اور اپنے روبرو خواجہ سید محمد امام کو صاحب
سماع بننے کی اجازت دیں۔ اور اپنے ہوتے ساتھ اور بڑے بڑے نامور خلفا اور بڑی بڑی
گھر کے قرابت والوں سے۔ خواجہ سید محمد امام ہی کو میر مجلس قرار دیں اور کسی دوسرے کو یہ
امتیازات اور یہ خصوصیات عطا نہوں۔

تم نے بالکل درست مثال دی ہے کہ ہمارے خاندان اور دوسرے لوگوں کا معاملہ
بالکل بنی ہاشم اور بنی امیہ کا سا ہے۔ سب مسلمانوں کو معلوم ہے کہ آنحضرت صلعم جتنی زیادہ محبت
حضرت علیؓ سے فرماتے تھے۔ اور جس قدر نزدیکی و تقرب کے امتیازات حضرت علیؓ کو عطا ہوئے
تھے۔ یہ سب بنی امیہ کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتے تھے۔ اور اموی خاندان کا ہر آدمی
علیؓ کی ان خصوصیات اعلیٰ کو ٹھنڈے دل سے نہ دیکھ سکتا تھا یہ خیال کسی اموی کو نہ ہوتا
تھا کہ حضرت علیؓ کی سی علمیت۔ قابلیت اور آنحضرت صلعم کے ساتھ قرابت بھی کسی اور
میں ہے؟ جس کے سبب آنحضرت کسی دوسرے کو بھی یہ امتیازات مرحمت فرماتے۔ حضرت
خواجہ سید محمد امام کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ وہ کم سنی کی حالت میں حضرت محبوب الٰہی کے بلانے
سے یہاں آئے اور حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے پیر کا نواسہ اور اپنے مربی و معلم روحانی کا
فرزند سمجھ کر نہایت محبت و ادب سے فرزند حقیقی کی طرح ان کو پالا اور تربیت کیا۔ اور خواجہ
سید محمد امام نے بھی ہوش سنبھال کر حضرت محبوب الٰہیؒ کو ہی اپنا باپ۔ اپنا پیر۔ اور اپنا سب
کچھ جانا۔ اور ان کے ساتھ ایسے وابستہ ہو گئے جیسے حضرت علیؓ آنحضرت کے ساتھ ہو گئے
تھے حضرت خواجہ سید محمد امام میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی خاص توجہ و تربیت کے سبب
علمیت و قابلیت تقویٰ و طہارت۔ ذوق و شوق اور حضرت محبوب الٰہی کے ساتھ فدائیت
اسی شان کے ساتھ تھی جیسی کہ حضرت علیؓ میں پائی جاتی تھی پھر حضرت خواجہ سید محمد امام کے
ساتھ حضرت محبوب الٰہی کے قرابتی بنی امیہ کا سا برتاؤ کیوں نہ کرتے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ

کے وصال ہوتے ہی حضرت خواجہ سید محمد امام اور ان کے بھائی کے ساتھ وہی برتاوے
شروع ہو گئے جو حضرت علیؓ کے ساتھ ہوئے تھے وہ دن ہے اور آج کا دن۔ یہ کشمکش
برابر جاری رہتی۔ مگر جس طرح بی بی فاطمہؓ کی [illegible] زمین سے محروم رہے مگر انکی روحانی و باطنی
شہریاری تمام عالم پر چھا گئیں۔ اور انکی دینی سلطنت کا سکہ دنیا کے سب ملکوں میں جم
چلا ہوا ہے اور چلتا رہے گا۔ اسی طرح سے حضرت خواجہ سید محمد امام کی اولاد دنیاوی توڑ جوڑ
کی باتوں میں تو مغلوب و مفتوح رہی۔ لیکن انکی روحانی و باطنی برتری چھ سو برس سے
آج تک قائم ہے۔ اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی روح پر فتوح کا تعلق آج تک خواجہ سید محمد امام
کی اولاد سے جوں کا توں ویسا ہی موجود ہے جیسا کہ عالم حیات میں تھا۔

انتہائی مصیبتوں کے زمانہ میں جبکہ خواجہ سید محمد امام کی اولاد کو اپنے عزیزوں سے
محفوظ رہنے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا تو وہ اپنی قدیمی روایات کی بموجب حضرت محبوب
الٰہی صاحبؒ کے روضہ میں جاتی ہے۔ ان کے مزار کا غلاف پکڑتی ہے اور رو رو کر کہتی ہے
"ہم آپکے ہیں اب یہاں سے کہاں جائیں۔ آپ ہی ہمارے سرپرست اور مربی
تھے۔ ہیں اور رہیں گے۔ آپ ہی ہم بیکسوں کی پناہ ہیں۔ آپ ہی ہم بے سہاروں کا سہارا ہیں
آپ ہی کی شفقت و عنایت کے بھروسہ پر ہم یہاں ٹکے ہوئے ہیں۔ بارگاہ الٰہی میں
ہمارے لیے عرض کیجیے تاکہ ہم ان فتنوں سے محفوظ رہیں۔ اور یہ دروازہ اور یہ دامن
ہمارے ہاتھ سے نہ چھٹنے پائے جسکو چھڑانے کی کوششیں کی جاتی ہیں"

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خواجہ سید محمد امام کی اولاد نے یہ آخری فریاد کی ہو اور وہ
محروم رہی ہو بلکہ ہمیشہ اور فوراً انکی مشکلات کی کشائش نامعلوم اور غیبی ذرائع سے
ہو جاتی ہے۔

پس میرے والد مرحوم حضرت خواجہ سید محمد امام کی اولاد میں سے تھے۔ اور انکا فرض تھا
کہ مجھکو ان قدیمی دعا مانگنے کے طریقوں سے آگاہ کر دیں۔ جیسا کہ انہوں نے کیا۔

نو برس کی عمر میں میرے والد نے ایک ترکی ٹوپی جس کا رنگ بہت لال تھا مجھ کو لا کر دی اسکو اوڑھ کر مجھے اپنی بادشاہی و برتری کا خیال پیدا ہوا۔ حضرت محبوب الٰہی کی درگاہ شریف میں مزار کے پائنتی جو سنگ مرمر کا فرش ہے اسمیں لال رنگ کا ایک پتھر ہے۔ میں لال ٹوپی اوڑھ کر اس لال پتھر پر بیٹھتا تھا اور سب لڑکوں سے کہتا تھا کہ مجھے بادشاہ کہو۔ اور درگاہ کے خیموں کے اوپر چڑھکے بیٹھتا اور دوسرے ہم عمر بچوں سے کہتا۔ میں تمہارا بادشاہ ہوں میرے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ میرے چچا سے اور مرحوم بھائی سید محمد غوث نے ایک دفعہ میرے دعوے سلطنت سے انحراف کیا تو میں نے دوسرے لڑکوں کو حکم دیا کہ ان کو مارو۔ ان لڑکوں نے کہا ہم نے تمہاری بادشاہی کو اسلئے مانا ہے کہ تم ہم کو اپنا وزیر بنالو اسلئے نہیں مانا کہ ہم دوسروں سے لڑیں بھی۔ میں یہ جواب سنکر آپے سے باہر آگیا۔ اور بولا کچھ ڈر نہیں ہے میں اکیلا ہی لڑونگا۔ چنانچہ میں لڑا اور اپنے بھائی مرحوم سے جسمانی قوت کم رکھنے کے باعث خوب پٹا۔ سید محمد غوث مرحوم نے میرا چہرہ لہولہان کر دیا۔ اور ایسی گت بنائی کہ دوسرا کوئی لڑکا ہوتا تو پھر کبھی بادشاہی کا نام نہ لیتا مگر میں نے دوسرے ہی دن پھر اپنے فاتح بھائی سے کہا کہ مجھکو بادشاہ مانو۔ ورنہ میں تم سے لڑونگا مرحوم سید محمد غوث مجھسے عمر میں ذرا کچھ بڑے تھے اور شاید اسی وجہ سے انہوں نے سمجھ سے کام لیا اور ہنسکر بولے میں تمہاری بادشاہی کو مانتا ہوں۔ مگر خیمے کے اوپر تمہارے ساتھ بیٹھونگا۔ نیچے ہاتھ باندھ کر کھڑا نہیں ہونگا۔ میں نے کہا مجھے یہ منظور ہے میں تمہیں خیمہ پر بیٹھنے کی اجازت دونگا مگر اپنے خیمہ پر نہیں۔ جو خیمہ میرے خیمہ سے ذرا نیچا ہے تم وہاں بیٹھو۔ کیونکہ تم بادشاہ نہیں ہو اور میں بادشاہ ہوں چنانچہ میرے مرحوم بھائی نے ایسا ہی کیا کہ وہ مجھسے نیچے خیمہ پر بیٹھے۔

میرے بھائیوں کو اس واقعہ سے معلوم ہو جائے گا کہ جنکے بڑے ہو کر کچھ کام

کرتے ہیں۔ اور ان سب کے بچپن میں اسی قسم کے واقعات پیش آیا کرتے ہیں۔ لہذا ان کے بچوں
میں سے کسی بچہ میں اگر اس قسم کے آثار نظر آئیں تو لازم ہے کہ اسکی تعلیم و تربیت کیطرف
نہایت گہری توجہ کی جائے۔ اور ایسے اسباب مہیا کیے جائیں۔ کہ جس کام کی طرف
بچہ کا رجحان پایا جاتا ہو اسی قسم کی تعلیم میں اسکو لگایا جائے۔

میرے بچپن کے زمانہ میں اگر میری قوم کے اندر حکومت لینے اور فاتح بننے کا
مادہ موجود ہوتا تو میں یقیناً اپنی جبلی خواہش اور قومی تاثرات سے فائدہ اٹھا کر کہیں نہ
کہیں کا بادشاہ ہو جاتا۔ مگر میرے گرد وپیش تو کوڑیاں مانگنے اور "کچھ نذر چڑھا اس
غلہ میں ڈال دیجئے" کی آوازیں تھیں۔ میں کیونکر فاتح بنتا۔ مجھ پر تو آس پاس کی حالتوں نے
یہ اثر ڈالا کہ اپنے خاندان کے دوسرے بچوں کی طرح میں بھی بھیک مانگنے لگا۔ "جو کچھ
نذر ہو اس غلہ میں ڈال دیجئے" کہنے لگا۔ اور دو آنہ آتے تو ایک آنہ چرا کر ایک آنہ
ظاہر کرنے لگا۔

چوری کرنے کا گناہ

خدا کے فضل سے میری ساری زندگی چوری اور
دغابازی سے پاک ہے۔ مگر بچپن میں جس قسم کی چوریاں
میں نے کیں ان کے خیال سے روح ہمیشہ نادم رہے گی۔ اور جب یہ واقعات یاد
آتے ہیں ضمیر مجھ کو رسوا کر دیتا ہے۔ اگرچہ جب میں نے ان چوریوں کا ارتکاب
کیا اسوقت میں ان کو چوری نہ سمجھتا تھا۔ اور تمام درگاہ والوں کو اسمیں مبتلا پاتا تھا (جو
آجتک اسمیں مبتلا ہیں)

اس چوری کی حقیقت یہ ہے کہ درگاہ کے اندر درگاہ والوں کے حصے مقرر ہیں
اور حصہ دار آپس میں ایک دوسرے کی چوری کرتے ہیں۔ اس طرح کہ ایک حصہ دار موجود
نہیں ہے اور درگاہ میں کچھ نذر آئی تو دوسرے حصہ دار نے اس نذر کو چرا لیا اور اپنے
شریک حصہ دار کو اسکی خبر نہ کی۔ یا ایک روپیہ آیا تو آٹھ آنے بتلائے۔

دوسری صورت چوری کی یہ ہے کہ درگاہ کے زیارت کرنے والے نے مثلاً ایک روپیہ کی مٹھائی نیاز دلانے کو بازار سے منگائی تو درگاہ والا لازمی طور سے بارہ آنے کی لائے گا۔ چار آنے چہارم کے نکال لینے اپنا حق تصور کرے گا۔ کیونکہ درگاہ والوں کا یہ دستور قدیم سے ہوتا آیا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ جن حصہ داروں کی میں نے چوری کی۔ ان حصہ داروں نے مجھ سے دس حصہ زیادہ میرے حق میں چوریاں کی ہونگی کیونکہ میں درگاہ میں بوجہ سلسلہ تعلیم کی مصروفیت کے بہت کم حاضر رہ سکتا تھا۔ اور وہ ہر وقت رہتے تھے۔ تاہم میرا ضمیر ان باتوں سے مطمئن نہیں ہے۔ اور اسکو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ دوسرے حصہ داروں کا حق چرالینا ایک صاف اور کھلی ہوئی چوری تھی جس کا ارتکاب میں نے بارہا کیا اور باوجود تلافی کی کوشش کرنے اور چوری کی مقدار سے زیادہ واپس دینے کے میرا دل خدا کے سامنے شرمندہ ہے۔ اور بچپن کی چوری کا دھبہ اور داغ خیال سے دور نہیں ہوتا۔

آج میری روح اپنے اور اپنے خاندان کے بچوں کو اس بلائے بد سے محفوظ رکھنے کو تڑپتی ہے اور میں خدا سے دعائیں مانگتا ہوں کہ ان سب کی معاش کو اس گناہ اور ذلت سے محفوظ رکھنے کی توفیق عنایت فرما۔ اور ایسے سامان پیدا کر کہ وہ سب ان گناہوں سے پاک صاف رہیں۔

جوتیوں کی حفاظت کا ایک آنہ

اس کتاب کے لکھنے کے زمانہ میں ایک دن ایک دوست کے ہمراہ درگاہ شریف حضرت محبوب الٰہی میں حاضر ہوا۔ اور جوتیاں باہر چھوڑ دیں (جیسا کہ قاعدہ ہے) وہاں جو محافظ فقیر بیٹھا تھا واپسی کے وقت اسکو کچھ دینا چاہا۔ مگر جیب میں اسوقت پیسے نہ تھے۔ روپیے تھے۔ میرے ساتھی نے ایکدو پیسہ اس فقیر کو دیدیا۔ اسی وقت مجھ کو یاد آیا کہ ایک زمانہ تھا کہ

میں بھی جوتیوں کی رکھوالی کیا کرتا تھا۔ اور ایک آنہ کا دلچسپ واقعہ پیش آتا تھا جبکہ بچپن میں فقیر دروازہ ہوتا تھا کہ
درگاہ کے متعلقین میں سے بعض لوگ یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ اور اسمیں انکو بہت
فائدہ ہوتا تھا۔ میں بھی کبھی کبھی جوتیوں کی رکھوالی کرکے پیسے کماتا تھا۔ چنانچہ ایک دن ایک
ہندو بابو کی جوتیوں کی حفاظت میں نے کی۔ اور جب وہ باہر آیا تو اس نے مجھ سے پوچھا
کہ میں تم کو کیا دوں میں نے کہا جو آپکا جی چاہے۔ وہ بولا۔ جو تم مانگوگے وہی دونگا۔
تم خوب سوچ کر مانگو اور جتنا زائد مانگ سکتے ہو کہو۔ میں وہی دونگا۔ میں نے سوچا
تو مجھ کو چار پیسے بہت زیادہ معلوم ہوئے۔ کیونکہ اور لوگ ایک پیسہ دیا کرتے تھے
اور چار پیسے سے زیادہ مجھے اور کسی رقم کا حال معلوم نہ تھا۔ اسلیئے میں نے کہا۔
مجھے تم چار پیسے دو۔ وہ بابو یہ جواب سنکر ہنسا اور اسنے چار پیسے مجھ کو دیدیئے۔

اس کے جانے کے بعد میرے خاندان کے لوگوں نے مجکو بہت طعنے دیئے اور
کہا کہ بڑا کم ظرف ہے۔ چار پیسے سے زیادہ نہ مانگے۔ ایک صاحب نے کہا اس کے
بڑے بھی کم حوصلہ اور چھوٹے دل کے تھے۔ مجھ کو ان باتوں سے بہت صدمہ ہوا
اور یہ واقعہ میرے دل پر نقش ہو گیا کہ لوگوں نے میری اس حرکت کے سبب میرے
بزرگوں کو بھی برائی سے یاد کیا۔

طفلی اور ناسمجھی کے زمانہ میں کوئی شخص بھی حوصلہ مند نہیں ہوتا اور اسکو
خبر نہیں ہوتی کہ زیادہ اور کم میں کیا فرق ہے۔ تاہم فقیر کو روپیہ دیتے وقت مجھے
اپنا بچپن یاد آیا اور میں نے اپنے نفس کو یاد دلایا کہ تیری اصلیت اتنی تھی۔ خدا
کا شکر ادا کر کہ آج اس نے تجکو اتنا دیا کہ تو نے ایک روپیہ کا دینا کچھ بات نہ سمجھا
پیر بھائیوں کو اس مثال سے سبق حاصل کرنا چاہیئے کہ جب خدا ان کو عروج دے
تو وہ اپنی سابقہ حالت کو یاد کیا کریں۔ اس سے ان کو ادائے شکر اور فضل خدا کی
احسانمندی کا لطف آئے گا جو تصوف کی روح رواں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت۔ میری عمر دس سال کی تھی۔ رات کو خواب دیکھا کہ میں ایک پہاڑ پر ہوں۔ صبح صادق کا وقت ہے۔ اور کچھ لوگ حلقہ بنائے ہوئے اس پہاڑ پر کھڑے ہیں جنکے وسط میں ایک صاحب ہیں جنکو لوگ کہتے ہیں کہ یہ حضرت رسول خدا صلعم ہیں۔ میں اس بھیڑ کے حلقہ کو چیر کر اندر گھس گیا۔ اور حضورؐ کے چہرہ کو دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اسوقت تک صبح نہیں نکلا ہے۔ مگر حضورؐ کے چہرہ پر دھوپ آرہی ہے۔ میں اسکو نہ دیکھ سکا اور بے تاب ہوگیا کہ حضورؐ کے چہرہ پر دھوپ کیوں ہے میں نے اپنے دونوں ہاتھ ملالیئے۔ اور اچک اچک کر حضورؐ کے چہرہ کی دھوپ روکنے لگا چونکہ میرا قد چھوٹا تھا۔ اسلیئے ہاتھ چہرہ تک نہ جاسکتے تھے۔ لیکن بار بار اچکنے سے میرا قد اونچا ہوگیا۔ اور میں نے اپنے ہاتھوں سے حضورؐ کے چہرہ کی دھوپ روک لی۔ جب دھوپ رک گئی تو میں بہت خوش ہوا اور حضورؐ نے تبسم فرماکر مجھ کو دیکھا جس سے میں نے محسوس کیا کہ حضورؐ میری اس خدمت سے خوش ہوئے۔

صبح کو میں نے یہ خواب اپنے استاد مرحوم حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا تمہارے ہاتھوں سے دین اسلام کا کوئی رخنہ درست ہوگا۔ اور وہ ایسا رخنہ ہوگا جس سے حضور سرور کائنات صلعم کی روح مطہر کو اذیت ہورہی ہوگی۔

اس تعبیر نے میرے ارادوں میں جو اسوقت بالکل خورد سال تھے ایک بزرگی اور بلندی پیدا کردی۔ اور اب جب میں کوئی اچھا اور دینی کام شروع کرتا ہوں یہ خواب مجھکو یاد آتا ہے۔ اور ایک زندگی میرے اندر پیدا کرتا ہے۔

مطبع اور اخبار کا خیال۔ میری عمر گیارہ سال کی تھی۔ ایک دن میرے والد صاحب چند دیگر اہل خاندان کے پاس بیٹھے ہوئے فرمارہے تھے

کہ دیکھو لالہ چرنجی لال صاحب نے چھاپہ خانہ جاری کیا۔ اور حضرت محبوب الٰہیؒ کا تذکرہ سیر الاولیا چھاپا (لالہ صاحب موصوف بھی درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے رہنے والے تھے) حالانکہ یہ کام ہم لوگوں کا تھا۔ یہ خدمت ہم انجام دیتے۔ کہ یہ ہمارا فرض تھا دوسرے حضرات نے جواب دیا کہ یہ سب کام علم سے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں سے علم کا چرچہ جاتا رہا تو لا محالہ اب دوسری قوم کے لوگ ہمارے مذہبی کام سے فائدہ اٹھائینگے۔

میں نے یہ تقریریں سنیں اور اسی وقت دل میں عہد کیا کہ بڑا ہو کر میں چھاپہ خانہ جاری کرونگا۔ اور ایسا کام کرونگا جس سے میرے ابا کا افسوس دور ہو جائے۔

اس مجلس میں لالہ میر سنگھ صاحب ساکن بستی موصوف اور لالہ فقیر چند صاحب ساکن عرب سرائے (لالہ فقیر چند اور مولوی سید احمد صاحب مرحوم مولف فرہنگ آصفیہ عرب سرائے کے باشندے اور اردو زبان کے ابتدائی اور بنیادی کام کرنے والوں میں تھے۔ ڈاکٹر فیلن کے ساتھ ان دونوں نے اردو لغت لکھنے کا بہت بڑا کام کیا تھا۔ اب لالہ فقیر چند کے صاحبزادہ لالہ مہورام بھی باپ کے لائق بیٹے اور میرے دوست ہیں) کا ذکر آیا۔ اور کسی اخبار یا رسالہ کا مذکور بھی ہوا۔ میں اخبار اور رسالہ کو تو نہیں سمجھ سکا لیکن یہ خیال ضرور کیا کہ جو چیز میرے بزرگوں کی نظر میں اچھی ہے اسکو میں ضرور کرونگا۔

گویا یہ پہلا تخم اخبار و مطبع کے شوق کا تھا جو کشت ذہن میں ڈالا گیا۔ میرے بھائیوں کو بھی چاہیے کہ اپنے بچوں کے سامنے قوم کے ضروری مسائل کا ذکر کیا کریں تاکہ ان کو کام کرنے کا ابتدا سے شوق پیدا ہو۔

بہن کا وقت آخر

میں گیارہ برس کا تھا جب میری بہن حسن بانو نے لمبے مرض فالج سے انتقال کیا۔ فالج کے بعد جب میں نے اپنی چاہنے والی بہن کو دیکھا جو پلنگ پر بے ہوش پڑی تھیں تو مجھ کو ایسا معلوم ہوا کہ خود اس مرض میں مبتلا ہوں اور اس احساس کو آج تک نہیں بھولا ۔

والدہ کا وقت آخر

بہن کی رحلت کے چار مہینے بعد والدہ بیمار ہوئیں اور ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ بہن کی جانکنی تو میں نے نہ دیکھی تھی۔ والدہ کا مرنا تمام و کمال دیکھا۔ وہ مجھ سے کہتی تھیں مجھ پر پڑھ کر دم کرو۔ میں پڑھتا تو وہ فرماتیں لاحول پڑھو۔ لاحول پڑھو۔ شیطان میرے پاس آتا ہے۔ میں ایمان اسکو نہ دونگی ان باتوں کو سنکر میرا کلیجہ دہلا جاتا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شیطان کو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔

جب ان کا سانس ختم ہو گیا۔ اور لوگ ان پر کپڑا ڈالنے لگے تب میں نے سمجھا کہ وہ مر گئیں۔ اور مجھے انکی محبتیں یاد آنے لگیں۔

والد کا وقت آخر

والدہ کے چار مہینے کے بعد والد بیمار ہوئے۔ وہ ڈاکٹری علاج نہ کرتے تھے۔ جب ان کو ڈاکٹری دوا پینے کے لیے مجبور کیا گیا تو انہوں نے فرمایا۔ آخر وقت میرا ایمان خراب نہ کرو۔

اسوقت میں سمجھا کہ ڈاکٹری دوا ایمان کے خلاف ہوتی ہے۔ اور برسوں میں نے بھی اسی خیال سے یہ دوا نہ پی۔

انتقال سے دو گھنٹے پہلے کہ چار بجے رات کا وقت تھا۔ والد نے مجکو اور میرے بڑے بھائی کو پاس بلا کر فرمایا۔

میرا وقت آخر ہے۔ اب تم میری جگہ غلام حسن خان صاحب ٹوہانوی کو سمجھنا (یہ بزرگ حضرت خواجہ شاہ اللہ بخش تونسوی کے خلیفہ اعظم اور میرے والد کے پرانے دوست ٹوہانہ ضلع حصار کے رہنے والے ہیں) اور میرے بڑے بھائی سے کہا اپنے چھوٹے بھائی کی دلداری کرنا کہ اسکی ماں بھی زندہ نہیں ہے۔

اسکے بعد فرمایا میری دو باتیں یاد رکھنا۔ ایک تو یہ کہ اپنی محنت سے روزی کما کر کھانا۔ دوسرے یہ کہ ضمانت کسی کی نہ دینا۔ اگر غلام کو

دے اُو ضمانت چاہنے والے کو پانسو روپے دیدینا۔ مگر ضمانت کے نام سے پانچ کوڑیاں بھی نہ دینا۔ پھر فرمایا۔ دیکھو پنجاب کے علاوہ سے مجکو کافی آمدنی تھی۔ اور اس علاقہ کی نذر و نیاز بھی آتی تھیں کہ میں روٹی سے بے فکر رہتا مگر میں نے ساری عمر جلد سازی کر کے پیٹ پالا۔ میں نے تم کو حلال روزی سے پرورش کیا ہے۔ تم بھی اپنی محنت سے حلال روزی حاصل کرنا اور نذر و نیاز پر نہ رہنا۔ تم کو لوگ جلد ساز کا بیٹا کہیں تو برا نہ ماننا کیونکر کوئی عیب نہیں ہے۔ ہاں اگر تم کو کوڑیاں مانگنے والا درگاہ کا مجاور اور خادم کہیں تو تم کو شرمانا چاہیئے کہ تمہارے قدیمی بزرگوں کا یہ کام نہ تھا۔

جلد سازی کا پیشہ بہت اچھا پیشہ ہے۔ میں اس سے پانچ روپے روزانہ بھی کما لیتا تھا۔ اگر تم اسکو قائم رکھو تو بہت ہی اچھا۔ ورنہ اپنا پیشہ ضرور کرنا جس سے کھانے میں نمک حلال اور محنت کی روزی کا پڑے۔ اگر تم نمک حلال کا کھاؤ گے تو تمہاری باتوں میں۔ تمہاری طبیعت میں اور تمہاری روحانیت میں اور ایمان میں ترقی ہوگی۔

اسکے بعد والد صاحب نے مجھ سے فرمایا جاؤ تم جاکر سو جاؤ میں اٹھکر چارپائی پر چلا گیا۔ اور سو گیا۔ خواب میں دیکھا ایک روشنی میرے والد کے پلنگ سے بلند ہوکر املی کے درخت پر چلی گئی۔ جو مکان کے صحن میں تھا اور املی پر کچھ دیر گردش کر کے کہیں غائب ہوگئی۔ یہ خواب دیکھکر میری آنکھ کھل گئی۔ تو سنا کہ لوگ رو رہے ہیں۔ اور معلوم ہوا کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ وہ جمعہ کا دن اور ۲۴ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ کی تاریخ تھی۔

خانگی تکلیفات

والد ماجد کی رحلت کے بعد برادر مرحوم سید حسن علی شاہ نے مجکو والدین سے زیادہ محبت و شفقت کے ساتھ پالنا شروع کیا۔ اور انہوں نے کوئی بات میری دلداری و دلجوئی کی باقی نہ رکھی۔ مگر وہ اپنی اہلیہ سے ابتدائی ایام میں کچھ مانوس نہ تھے۔ اور انکی باہمی رنجشوں سے مجکو بہی تکلیف

اٹھانی پڑتی تھی۔ مثلاً یہ کہ وہ دونوں آپس میں کبیدہ ہوتے تو کھانا نہ کھاتے اور میں بھی ان کے سبب نہ کھاتا۔ اور تعلیم کی محنت کے زمانہ میں کئی کئی وقت بھوکا رہنا مجھکو بہت کمزور کر دیتا۔ یا بھائی سفر میں چلے جاتے (جو اکثر جاتے تھے) تو مجھکو ان کی عدم موجودگی میں ناگفتہ بہ اذیتیں برداشت کرنی پڑتیں۔ اور اسوقت مجھکو والدین کی یاد ستاتی۔ اور میں آسمان کو دیکھ دیکھ کر ٹھنڈے سانس بھرتا اور اپنی والدہ کی قبر پر جا کر اسکو چمٹ کر زار و قطار رویا کرتا تھا۔

اس تکلیف جسمانی و روحانی سے مجھکو کئی سال سابقہ رہا۔ اور اس سے میری جسمانی ترقی رک گئی اور میں بہت کمزور و بیمار رہنے لگا۔

قصہ مختصر والدین کے بعد شادی تک میری زندگی ایسی پر الم و پر غم گزری کہ خدا کسی شخص کو وہ نصیب نہ کرے۔

ایک وجہ میری تکلیف کی خود میری صورت بھی تھی۔ میری شکل دیکھنے والوں کو شاید بہت اچھی معلوم ہوتی ہوگی۔ کہ بہت سے دعویدار اس کا اظہار مجھ سے کرتے تھے۔ اور ہر روز ایک نیا دعویدار ظاہر ہوتا تھا۔ بھائی مرحوم میرے باپ کی جگہ تھے۔ انکا فرض تھا کہ مجھ کو برے اور آوارہ لوگوں سے بچاتے۔ چنانچہ انہوں نے بڑی سختی سے بندشیں لگائی تھیں۔ اور میں کسی شخص سے بات نہ کر سکتا تھا۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ میں بد چلن اور آوارہ صحبتوں سے قطعاً محفوظ رہا۔ تاہم اس سلسلہ میں بھائی صاحب کے اوہام اور غلط شکوک میرے لئے باعث اذیت ہوتے تھے۔ کہ وہ شریف اور نیک چلن آدمیوں کو بھی بد معاش تصور کرتے تھے اور علانیہ انکی توہین کر ڈالتے تھے۔

آج میں محسوس کرتا ہوں کہ اولاد اور ماتحت بچوں کی نگرانی کے لئے یہ سخت طریقہ مناسب نہیں ہے۔ اور نہ وہ بے پروائی مناسب ہے جو اکثر والدین کرتے ہیں۔ اور

اسکے سبب اکثر بچے آوارہ صحبتوں میں پھنس جاتے ہیں۔ اسکے لیے ضرورت یہ ہے
کہ حکمت عملی اور نرمی سے ان اسباب کو دفع کیا جائے جو مضر معلوم ہوں۔ اور بچوں
کو بہت موقعوں اور ملائم طریقے کے ساتھ بداطوار لوگوں سے بچایا جائے۔ سخت باز پرس
اور علانیہ غیظ و غضب سے بچے بے راہ ہو جاتے ہیں۔ اور ان کو ایک طرح کی ضد اپنے
بڑوں سے ہو جاتی ہے۔

میں نے اپنے بھائی کی اطاعت سے ان معاملات میں کبھی سرتابی نہیں کی البتہ
منشی غلام نظام الدین صاحب تاجر کتب دہلی (جو اب بھی موجود ہیں) اور حافظ عبد الغنی
مرحوم تاجر جفت دہلی کے ملنے پر میں نے بھائی صاحب مرحوم کا بہت کم کہنا مانا کیونکہ
میں ان دونوں کو پاکباز۔ اور اپنا بہت ہی خیرخواہ مخلص دیکھتا تھا۔ چنانچہ منشی غلام
نظام الدین صاحب نے آجتک وہی تعلق قائم رکھا ہے۔ اور اپنی ہمدردی کو ایک ذرہ
کے برابر بھی کم نہیں کیا۔ اور میں علی الاعلان اقرار کرچکا ہوں اور کرتا ہوں کہ لکھنے پڑھنے
اور دنیا میں نیک کام کرنے کی ترغیب دلانے والے۔ اور پھر قدم بقدم آگے بڑھانے
والے یہی بزرگ ہیں۔ جنہوں نے میرے باعث مرحوم بھائی کے بڑے بڑے جور برداشت
کیئے ہیں اور میں نے بھی ان کے ملنے اور ان کے مشوروں پر چلنے کے سبب ناقابل
بیان اذیتیں اٹھائی ہیں۔

منشی غلام نظام الدین صاحب

عرف خاکسار عالم جنکی تجارت کتب کی دکان
چاندنی چوک میں ہے ایک مستند اور شریف
ہندو خاندان سے ہیں۔ ابتدائی عمر میں اپنے شوق سے مسلمان ہوئے۔ اور غلام نظام الدین
نام رکھا۔ ان کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ سے بہت عقیدت و محبت تھی
اور ان کے مزار پر ہر بدھ کو دہلی سے حاضر ہوا کرتے تھے۔ اور شاید ۲۴ برس تک ایک بدھ
بھی انہوں نے ناغہ نہیں کیا۔

مَیں تیرہ سال کی عمر سے انکو درگاہ شریف میں حاضر ہوتے دیکھتا تھا لیکن وہ اس سے بھی سالہا سال پیشتر کے حاضر باشوں میں اس درگاہ کے تھے۔ لالہ پیارے لال جوہری جنکو ہم بچپن میں بدھ والے لالہ کہتے تھے اور ان خاکسار عالم صاحب کی پابندِ حاضری سب لوگوں میں ضرب المثل بن گئی تھی۔ خاکسار صاحب کا دستور تھا کہ پہلے درگاہ کی باؤلی میں غسل کرتے پھر اندر حاضر ہوتے۔ مَیں نے بارہا دیکھا کہ ان کو شدت کا بخار چڑھا ہوا ہے اور وہ اپنی وضعداری کے خیال سے اور حسن عقیدت کے جوش سے باؤلی میں نہا رہے ہیں۔ مَیں نے سنا کہ ایکدفعہ ان کے لڑکے کا انتقال ہوگیا۔ مگر انہوں نے فرزند کی تجہیز و تکفین سے پہلے بدھ کی حاضری کو پورا کیا۔ اور واپس آکر جوان لڑکے کو اول منزل پہنچایا۔ اس سے بڑھ کر عقیدت کی صداقت کا اور کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا۔

خاکسار صاحب نے شروع شروع میں مجھکو دیکھا تو یہ کہا کہ "میاں پیرزادگی کا گھمنڈ بہت بری چیز ہے جس نے اپنے آپ کو کچھ سمجھا وہ کچھ نہ رہا جس نے کچھ نہ سمجھا وہ سب کچھ ہوگیا"

مَیں نے انکی بات کو غور سے سنا۔ اگرچہ یہ فلسفیانہ باتیں سمجھ میں تو نہ آئیں مگر ان سے دل کو لگاؤ ہوگیا۔ اور جب بدھ کو وہ آتے تو میں کچھ دیر انکی باتیں سنتا اور ان کے پاس بیٹھتا۔

خاکسار صاحب حضرت شاہ غلام حسن خان صاحب ٹوہانوی کے مرید تھے اور ٹوہانوی صاحب وہ بزرگ ہیں جن کا ذکر ابھی لکھا گیا کہ میرے والد نے انکی اطاعت کی وصیت فرمائی تھی۔ اسواسطے خاکسار صاحب بھی سلسلہ سلیمانیہ تونسویہ کے دیگر مریدین کی طرح میرے بھائی کے دائرہ حکومت میں تھے (درگاہ میں دکالت کا جو دستور ہے اُسی طرف لفظ حکومت میں اشارہ ہے) اور خاکسار صاحب کے مجھ سے ملنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ مگر مرحوم بھائی صاحب کو انکی نسبت بھی شکوک پیدا ہوئے اور تعلق

تھے ایک صاف سلجھاؤ کی صورت بتا دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہندو ان کو قطب اور ولی سمجھتے ہیں اور ان کے اقوال سے شگون لیتے ہیں۔

خاکسار صاحب کی وضعداری کا یہ حال ہے کہ میری ابتدائی ملاقات کے ایام میں دو پیسہ کے پان میرے لئے لایا کرتے تھے۔ وہ رسم اُنکی آجتک جاری ہے۔ شادی ہو گئی تو میری بیوی کو یہ پان پہنچتے رہے۔ ان کا انتقال ہو گیا تو میری لڑکی کے ساتھ یہ وضع جاری رہی اور اب میری دوسری بیوی کو پان پہنچ جاتا ہے۔

میرے ہی ساتھ نہیں بلکہ جنکو میں دوست رکھتا ہوں ان کے دکھ درد کے بھی ایسے ہی شریک ہیں گویا وہ انہی کے سہنے والے ہیں۔ چنانچہ واحدی صاحب۔ اور اڈیٹر صاحب اسوۂ حسنہ۔ اور دیگر چند احباب کے ساتھ ان کا یہی برتاؤ ہے۔ اور یہ احباب بھی میری طرح انکو اپنا بزرگ جانتے ہیں۔ اور ان کے مشورہ بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔

خاکسار صاحب کی اس سرسری سرگذشت سنانے کے بعد مجھے اپنے مرحوم بھائی کا احسان بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ انہوں نے بدچلن زمانہ سے میری جس قدر حفاظت کی یہ ان کا فرض تھا۔ اور اس سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ اور میں کسی خراب صحبت میں مبتلا نہ ہوسکا خاکسار صاحب کی نسبت انکی بدظنی رائے کی غلطی تھی مگر نیت کی کجی نہ تھی۔

حافظ عبدالمغنی صاحب خاکسار صاحب کے ابتدائی بیان میں حافظ عبدالمغنی صاحب کا نام آیا ہے۔ وہ چوڑی والوں کے محلہ میں رہتے تھے۔ اور حافظ نصیرالدین صاحب مشہور بڑے تاجر جفت کے فرزند تھے۔ حافظ نصیرالدین صاحب ایک مرد کامل اور ولی اللہ بزرگ تھے تجارت جفت آخر میں ترک کردی تھی۔ ان کے صاحبزادہ حافظ صاحب موصوف بھی بہت نیک چلن اور اللہ والے تارک دنیا شخص تھے وہ بھی خاکسار صاحب کے ساتھ رہتے تھے ان کو میرے ساتھ دعوے عشق تھا۔ مگر وہ مغلوب الغضب بہت تھے اور بھائی صاحب کی مخالفت سے بہت جلد افروختہ ہو جاتے تھے۔ ایک دن انہوں نے میرے

بھائی کو سرپرست کچھ برا کہا۔ میں نے بھائی کی حمایت کی۔ اور ان کو سمجھایا کہ وہ میرے سرپرست ہیں۔ انکی احتیاط حق بجانب ہے۔ اسپر حافظ صاحب کو غصہ آگیا۔ اور انہوں نے کہا محبت سب سے بڑی ہے۔ میں نے کہا۔ میں محبت سے واقف نہیں ہوں۔ نہ مجھے موجودہ تعلیمی مصروفیت کے سبب محبت پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ حافظ صاحب اس کلام سے مشتعل ہوکر چلے گئے اور چند روز کے بعد سنا گیا کہ انہوں نے گندھک کا تیزاب پی لیا۔ جس سے ان کو فوراً خون کی قے آنے لگی۔ ان کے قرابت داروں اور والد کو خبر ہوئی۔ ڈاکٹری امداد اسیوقت مہیا ہوگئی۔ مگر وہ ۲۴ گھنٹے سے زیادہ زندہ نہ رہے۔ اور انتقال کر گئے۔ ان کی قبر درگاہ شریف کے لنگر خانہ کے پاس بنائی گئی۔

تھیٹر کا شوق

میں پندرہ سال کا تھا۔ دہلی میں ایک تھیٹریکل کمپنی آئی تھی اور اسکا بہت چرچہ ہوا تھا۔ یہاں تک کہ سقوں نے اپنی مشکیں اور بہلیوں نے اپنے بیل فروخت کرکے اس کمپنی کا تماشہ دیکھا تھا۔

اس کمپنی کے مالک درگاہ میں آئے تو کچھ مفت کے ٹکٹ دے گئے میں بھی درگاہ والوں کے ساتھ یہ مفت کا تماشہ دیکھنے گیا۔

پہلا تماشہ دیکھ کر میں دیوانہ ہوگیا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میری عقل کا ذرا سا حصہ بھی باقی نہ تھا۔ اور سب پر تماشے کا طلسم مسلط ہو گیا تھا۔ آدھی رات کو میری آنکھ کھلتی تو میرے کان گانا سنتے۔ اور انہیں ہو بہو ایکٹروں کی آوازیں آتیں (اس بیان میں شاید عقلمندوں کو مبالغہ معلوم ہوگا۔ مگر یہ بالکل سچا بیان ہے۔ اور اسمیں ایک حرف کی بھی زیادتی نہیں ہے) حالانکہ اسوقت میں اپنے گھر کے اندر اپنی چارپائی پر پڑا ہوتا تھا۔ تماشے کے وقت ہر اجنبی آدمی کو میں تماشہ والا جانتا اور سمجھتا۔ اور تماشے کا منظر میری آنکھوں سے جدا نہ ہوتا۔

کھانا پینا۔ سونا۔ پڑھنا۔ سب زہر معلوم ہوتا تھا۔ اور تماشہ کے سوا کسی چیز سے

نہ آتا تھا۔ مگر میرے پاس روپیہ پیسہ نہ تھا جو دوبارہ ٹکٹ لیکر تماشہ دیکھتا۔

اسی زمانہ میں ایک شخص نے درگاہ کی نذر کے مجھکو تین روپے دیے۔ جن سے میں نے بارہ راتیں مسلسل تماشہ دیکھا۔ اس زمانہ میں ایک عمل پڑھنے کا شوق تھا۔ اور اسکے سبب رات کو درگاہ میں سوتا تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد کھانا کھاکر میں درگاہ میں آتا۔ اور وہاں سے چپ چاپ چھ میل طے کرکے دلی پہونچتا۔ چار آنہ کا ٹکٹ لیکر تماشہ دیکھتا۔ اور پھر رات کو ۲ بجے جنگل بیابان اور ڈراؤنے راستہ سے گذر کر چار میل کی مسافت پیدل طے کرکے درگاہ آتا اور سو جاتا۔ عمل پڑھنا تو چکر ہوگیا۔ اور تھیٹر کی تھکان کے سبب دن بھر میری آنکھیں سرخ اور خمار آلود رہتی تھیں۔ اور لوگ سمجھتے کہ میں عبادت اور شب بیداری میں مصروف رہتا ہوں۔ اور بھائی سمیت سب گھر والے میرے بہت معتقد ہوگئے تھے۔

بارہ رات کی تھکان نے بیمار ڈالدیا۔ اور مہینوں کی بیماری کے بعد میرا یہ نشہ ذرا کم ہوا۔ گو اسکے بعد بھی برسوں یہ شوق جاری رہا۔ لیکن وہ بے عقلی و خود فراموشی کی حالت نہ تھی۔

آج میں اس واقعہ کے تجربہ سے اپنے پیر بھائیوں کو نصیحت کر سکتا ہوں کہ اپنے نوعمر بچوں کو تماشہ ہرگز نہ دکھائیں۔ یعنی تھیٹر نہ جانے دیں ورنہ یہ بلا ان کو پڑھنے لکھنے سے کھو دیگی۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ڈرامے۔ اور تھیٹر کے تماشے عقل۔ مشاہدہ اور تجربہ بڑھاتے ہیں۔ مگر علم اور سمجھ حاصل ہونے کے بعد (جو تیس برس سے پہلے عموماً حاصل نہیں ہوتی) تماشہ دیکھنا مفید ہوتا ہے اس سے پہلے زہر ہلاہل ہے۔ اور ہلاک کرنیوالا مرض ہے۔

اخبار کا شوق میری عمر شاید سولہ برس سے کچھ ہی زیادہ ہوگی مولوی برکت اللہ صاحب گشتی پوسٹ ماسٹر خواجہ سرائے نے مجھکو اخبار ہادی مراد آباد کا ایک پرچہ دیا۔ اور کہا اسکو دیکھو۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے۔ بولے اخبار ہے۔ میں

نہیں جانتا تھا اخبار کیا ہوتا ہے۔ میں نے اسکو پڑھا۔ اور میرا جی اسمیں بہت لگا۔ اسکے بعد میں نے جامع الاخبار مراد آباد۔ انڈیا گزٹ بمبئی۔ اور افضل الاخبار دہلی۔ پرچے خرید کر اپنے نام جاری کرا لئے۔ اور پڑھتے پڑھتے مجکو لکھنے کا شوق ہوا۔

سب سے پہلا مضمون انڈیا گزٹ بمبئی میں انڈیا کی نازک حالت کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ جو اصلاح کے بعد شائع ہو گیا۔

اس مضمون کے شائع ہونے سے مجکو اس قدر خوشی ہوئی جس کا اظہار ناممکن ہے مگر بڑے بھائی صاحب نہایت ناراض ہوئے۔ اور انہوں نے اس مشغلہ کو بہت برا سمجھا اسلیئے میں چپکے چپکے مضامین لکھنے لگا۔

ایکدن جناب میر ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی جو حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار ہیں (جناب فراق بڑے قادر الکلام شاعر بزرگ صفت اہل دل۔ اور پابند وضع شخص ہیں ان کے مضامین رسالوں میں بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھے جاتے ہیں) میرے بزرگوں سے ان کے بزرگوں کے تعلقات رہتے آئے ہیں۔ بھائی مرحوم سے انکی بہت دوستی تھی۔ درگاہ میں تشریف لائے۔ اور ان کے سامنے بھائی نے مضامین نویسی کا ذکر کیا تو انہوں نے بھائی صاحب کو بہت ڈرایا۔ اور کہا یہ کام بہت مخدوش ہے۔ ایسا نہ ہو کوئی الٹا سیدھا مضمون لکھدیں اور اس سے مقدمہ قائم ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی اپنی مضمون نگاری اور ایک لائبل کیس کا ذکر بھی کیا۔

فراق صاحب کا یہ کہنا عین دوستی اور خلوص پر مبنی تھا۔ مگر میرے لیئے وہ قیامت ہو گیا۔ اور بھائی صاحب نے نہایت سختی مضامین لکھنے کے خلاف کرنی شروع کی۔

خاکسار صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجکو سہارا دیا۔ اور کہا ابھی اخبار میں مت لکھو۔ بلکہ کتابیں لکھنی شروع کرو۔ اسمیں کچھ خطرہ نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے مولانا شرر کی تقلید میں ایک ناول لکھا جس کا مضمون مجھے یاد نہیں کہ کیا لکھا تھا۔ لکھنے کے بعد

کتاب فروش عبدالجبار خان (یا اسی کے قریب کچھ نام تھا) مجھکو خیرآباد کے عرس میں ملے اور انہوں نے اس ناول کا ذکر سنکر کہا کہ مجھکو وہ ناول ڈاک کے ذریعہ بھیجدو۔ میں اسکو شائع کردونگا۔ میں نے دہلی آکر خوشی خوشی ناول ان کو بھیجدیا۔ آٹھ دن کے بعد خط آیا کہ ناول تو یہاں کسی کو بھی پسند نہیں آیا۔ ہم اسکو نہیں چھاپ سکتے۔

اس اطلاع سے میری ہمت ٹوٹ گئی۔ اور میں نے لکھنے کا مشغلہ ترک کردینے کا فیصلہ کرلیا۔ خاکسار صاحب سے ذکر آیا تو وہ ہنسے۔ اور انہوں نے کہا۔ ابھی سے گھبرا گئے۔ شروع شروع میں یہی ہوا کرتا ہے۔ ہمت نہ ہارو۔ برابر لکھتے رہو۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ لوگ تمہاری تحریر منگانے کو بے قرار ہونگے۔ اور تم ان کو ایسے ہی روکھے جواب دوگے جیسا کہ لکھنوی کتاب فروش نے تم کو جواب دیا ہے۔

میں نے پھر لکھنا شروع کیا۔ اور پیسہ اخبار وغیرہ میں میرے مضامین شائع ہونے لگے۔ اور اسکے بعد وکیل امرتسر وغیرہ مستند و ممتاز اخباروں نے بھی میری تحریریں چھاپنی شروع کردیں۔

سفلی اعمال کا شوق

اسی زمانہ میں مجھکو تسخیر ہمزاد۔ مسمریزم۔ اور سفلی عملیات کا شوق پیدا ہوا۔ اور ان کے حصول میں ہر قسم کی محنتیں اور جستجو کرنے لگا۔ ہمزاد کے متعدد طریقے آزمائے۔ اور انمیں بڑی بڑی ناہنجار وحشتناک ریاضتیں کی گئیں۔ اگرچہ ایک حد تک اس جانکنی کا صلہ حاصل ہوا تاہم محنت شاقہ اور اوقات عزیز کے خرچ کے مقابلہ میں وہ بالکل ہیچ اور ناکافی تھا۔

البتہ مسمریزم کی مشق بڑھنے سے مجھ میں سلب مرض کی ایک غیر معمولی قوت پیدا ہوگئی۔ اعصابی امراض اور خیالی وہمی علالتیں پانچ منٹ کے اندر دور کردیتا تھا۔ دق کے بعض بیماروں کا بھی جرأت خیز علاج کیا۔ اور وہ اچھے ہوگئے جب فقط محمد عمر مرحوم چاوڑی والے ساکن کوچہ استاد جو دق کی آخری حد پر پہنچ

گئی تھیں۔ اور انگریزی و یونانی اطبا نے جواب دیدیا تھا۔ میں نے صرف تین دن مسمریزم کے طریق سلب سے انکا علاج کیا۔ اور وہ اچھی ہو گئیں۔ اور ابتک موجود ہیں گو ان کے شوہر سابق کا انتقال ہو چکا ہے۔ جنکی خاطر سے میں نے یہ علاج کیا تھا۔ حافظ صاحب کے اس واقعہ سے غلغلہ مچ گیا۔ اور ہزاروں بیمار میرے پاس آنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک مریض دق کے سلب مرض کے سبب میں خود دق میں مبتلا ہو گیا۔ اور بہزار دقت و پریشانی اچھا ہوا۔ جبسے میں نے سلب کا علاج ترک کر دیا۔

آشوب چشم کے علاج میں تو میرا مسمریزم عجیب کرشمہ دکھاتا تھا جہاں میں نے تین بار آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے مس کیا۔ اور آشوب معدوم ہوا۔ ایک منٹ کی دیر بھی نہ لگتی تھی۔ مگر میں جب خود دق میں مبتلا ہوا تو یہ تمام معالجات ترک کر دئیے۔

سفلی اعمال کا کوئی بدتر سے بدتر طریقہ بھی باقی نہیں چھوڑا۔ اور اس غلیظ کوچہ کی ہر گلی کو دیکھا۔ لیکن جب توبہ کی تو پھر اسکے خیال کو بھی پاس نہ آنے دیا۔

میں بھائیوں کو اپنے تجربہ کی بنا پر نصیحت کرتا ہوں کہ وہ عملیات سفلی ہوں یا علوی ہمزاد ہو یا اور کوئی مؤکلات کا عمل انہیں کبھی کا شوق بھی پیدا نہ کریں۔ یہ بالکل فضول اور احمقانہ خبط ہیں۔ اور ان سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ سوائے اسکے کہ انسان وقت دولت اور صحت برباد کر دیتا ہے۔

اسباب ظاہری کی سعی بہت صاف اور مفید عمل ہے۔ کوئی ہنر سیکھو۔ کوئی علم حاصل کرو۔ کوئی تجارت کر کے دیکھو کہ اسمیں دونوں جہان کا فائدہ ہے۔ اور ان عملیات میں کچھ بھی نہیں ہے۔ محض دنیا کی بے عقلی کا ایک بہاؤ ہے۔ کہ جس طرف بہت سے بیوقوف بہتے ہیں انکی دیکھا دیکھی دوسرے بھی بہنے لگتے ہیں۔

البتہ مسمریزم اور اسکے دیگر ترقی یافتہ طریقے کچھ کار آمد ہیں۔ خیال اور نظر کی قوت جمع کرنے کیلئے تھوڑا سا کام دینے لگتا ہے۔ مگر عموماً یہ بھی ایک طرح کا تماشا

اور شعبدہ بازی کا کھلونا ہے۔ خدا کی یاد اور اشغال صوفیہ سے جو قوت خیال کو اور نظر کو حاصل ہوتی ہے وہ مسمریزم سے لاکھوں درجہ بڑھ کر ہے۔

مجھے کیمیا کا شوق کبھی نہیں ہوا۔ حالانکہ میرے دادا۔ میرے والد۔ اور میرے بھائی کو اسکا بہت ذوق تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی وقت ضائع کرنے اور دولت کھونے کا ایک جنون ہے۔ اور اسکا شوق کچھ بھی مفید نہیں ہے۔ کیمیا گروں کو البتہ کشتے پھونکنے آجاتے ہیں لیکن یہ قابلیت بہت عرصہ کے بعد ہوتی ہے اور لاکھوں کروڑوں روپیہ کا قیمتی وقت برباد اور ضائع کرنے کے بعد یہ قابلیت کچھ زیادہ قیمتی ثابت نہیں ہوتی۔

شادی اور رسومات کا جھگڑا

اٹھارہ برس کی عمر میں میری شادی ہوئی۔ اسوقت میں نیا نیا گنگوہ سے پڑھ کر آیا تھا۔ اور مراسم شادی کے خلاف وعظ کہنے کا مجھکو بہت شوق تھا۔ اپنی شادی کے وقت بھی میں نے بڑی بحث بازیاں کیں۔ اور رسوم بدعت کو روکنا چاہا۔ مگر بھائی اور خاندان کے سامنے میری کچھ نہ چل سکی۔ اور سوائے چند خاص وقبیح مراسم کے ترک کے باقی سب مجبوراً کرنی پڑیں۔

شادی کے بعد میری زوجہ کے بھائی اور میرے بھائی میں کچھ اس قسم کے جھگڑے پڑے کہ میری بیوی ایک سال اپنے میکہ میں بیٹھی رہیں۔

لیکن جب خاکسار صاحب کے مشورے واجازت سے میں نے بھائی سے علیحدہ رہنے کا تہیہ کر لیا۔ تو میری بیوی میکہ سے آگئیں۔ اور میں ان کے ساتھ ایک علیحدہ مکان میں رہنے لگا۔ اور گھرداری کے خرچ کا یکایک ایک بوجھ مجھ پر آن پڑا۔ جسکے سبب ابتدا میں بڑی تکلیفوں کا سامنا ہوا۔ کیونکہ میں نے ایک طرف تو درگاہ کے طریقہ معاش کو ترک کر دیا تھا اور دوسری طرف بھائی سے جدا ہونے کے باعث انکی امداد بھی لینی چھوڑ دی تھی۔

عمارات دہلی کے نقشے اور کتابیں فروخت کرنے کو دہلی سے باہر جاتا اور کبھی درگاہ کے زائرین کے ہاتھ فروخت کرتا۔ اور اسطرح بہزار دقت دو آدمیوں کا خرچ نکلتا۔ اور کبھی

کچھ نہوتا تو ہم دونوں فاقہ سے بسر اوقات کرتے۔

خدا جنت نصیب کرے میرے مرحوم بھائی کو کہ وہ الگ ہونے کے بعد بھی وقتاً فوقتاً مدد کرتے تھے۔ جسکو کبھی میں لے لیتا اور کبھی نہ لیتا۔

تعزیہ کی مخالفت درگاہ کی طرف سے ایک تعزیہ بنا کرتا ہے۔ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب مکان پر آیا تو تعزیہ کے خلاف تقریریں کرنے لگا۔ اور اسکو بت پرستی سمجھ کر شدومد سے اسکی مخالفت شروع کی۔ کچھ نوجوان میرے ہم خیال ہوگئے۔ اور باقی تمام خاندان دشمن ہوگیا اس جدوجہد میں مجھکو سخت امتحان دینے پڑے۔ اور پولیس تک نوبتیں پہونچیں۔

مگر شادی ہونے کے بعد میری زندگی کا جوش وخروش اعتدال پر آگیا۔ اور ناتجربہ کاروں کی طرح بے محابا باتیں کرنی میں نے چھوڑ دیں۔ گو تعزیہ کو اب بھی ناجائز اور مسلمانوں کے مسلک توحید کے سراسر خلاف سمجھتا ہوں۔

حکام انگریزی سے میل جول خاکسار صاحب کے مشورہ سے شادی کے بعد میں نے دہلی کے انگریزی حکام سے ملنا جلنا شروع کیا۔ اور بہت جلدی انمیں میرا اعتبار رسوخ بڑھا۔ کہ لارڈ کرزن تک رسائی ہوگئی۔ لارڈ کرزن بعض اوقات اپنے ہاتھ سے مجھ کو خط لکھتے تھے۔ انکے جانے کے بعد لارڈ منٹو سے گورنمنٹ ہوس کلکتہ میں ملاقات ہوئی۔ اور لاٹوش صاحب لفٹننٹ گورنر (یو۔پی) سے بھی رسم پیدا ہوئی۔ اور وہ بھی اپنے ہاتھ سے دوستانہ خطوط لکھنے لگے۔

حکام دہلی کی عنایت کے سبب پرنس آف ویلز سے (جو آجکل کنگ جارج ہیں) بھی ملاقات ہوئی۔ جبکہ وہ درگاہ کی زیارت کو آئے تھے۔ اور امیر حبیب اللہ خان صاحب بادشاہ کابل نے بھی ملاقات کا بے تکلفانہ موقع دیا۔

ہندوؤں کے تیرتھوں کی سیر

۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء میں خاکسار صاحب کی ہدایت نے ہندو فقرا سے ملنے اور ہندو تیرتھ گاہوں کی سیر کرنے کا شوق دلایا۔ دہلی سے چلکر پہلے متھرا اور بندرابن میں قیام رہا اور عرصہ تک وہاں کے مقیم فقرا کی خدمت میں حاضری دی۔ اس سفر میں ایک کمبل ایک جھولی۔ اور ایک رنگین لمبے کرتے کے سوا میرے پاس کچھ سامان نہ تھا۔

متھرا سے اجودھیا۔ بنارس۔ گیا۔ بدھ گیا۔ ہردوار رکھی کیش وغیرہ جانا ہوا۔ اور یہاں کے مشہور مندروں کو دیکھا اور بعض فقرا سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اس طولانی سفر کے حالات بعض رسائل میں متفرق طور سے کبھی کبھی شائع کرائے۔ مگر وہ اتنے زیادہ اور عجیب تھے کہ ایک مستقل رسالہ تیرتھ یاترا کے نام سے لکھنا پڑا۔ یہ رسالہ چھپ جاتا تو اس زندگی اور سیر کا بڑا موثر نظارہ دکھاتا لیکن ۱۹۰۸ء کی شدید مخالفتوں نے جن کا ذکر اوپر آیا ہے اسکے شائع کرنے سے باز رکھا کیونکہ اسی سفر کو خاندانی مخالفین نے عداوت نکالنے اور عوام کو بھڑکانے اور بدگمان کرنے کا حیلہ قرار دیا تھا۔ کافر ہندو اور بت پرست کے خطابات اسی سیاحت نے دلوائے تھے۔

اب کبھی فرصت ہوگی تو پرانے کاغذات میں اس رسالہ کو تلاش کر کے چھاپ دیا جائے گا۔ کیونکہ آجکل خدا کے فضل سے تعصبات کا وہ زور نہیں ہے۔

عمر ۲۰ برس غالباً

اسی زمانہ میں ایک عرصہ تک اخبار وکیل امرتسر کے دفتر میں قیام رہا۔ اور جب ہی پہلی مرتبہ انجمن حمایت اسلام کا جلسہ دیکھا۔ وکیل آفس کے ایام قیام میں پہلی بار مولانا ابو النظر آہ اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات ہوئی اور حافظ عبدالرحمٰن مرحوم سیاح ممالک اسلامیہ سے

بھی ہم نشینی رہی۔

اخبار وکیل امرتسر کے مالک و بانی شیخ غلام محمد مرحوم کی اس چند روزہ صحبت نے اخلاق و عادات اور ضروریات قوم سے آگاہ کر کے طرح طرح کے ذاتی تجربے سکھلائے خصوصاً شیخ غلام محمد مرحوم کے اخلاص و صداقت نے جو سارے پنجاب کے اخبار نویسوں میں ممتاز شان رکھتی تھی دنیا میں تحریری خدمت قوم کا ایک راستہ بتایا۔

پنجاب کا تیسرا سفر

والد مرحوم اور بھائی مرحوم کے ہمراہ پنجاب کے دو سفر خردسالی میں کیے تھے، تیسرا سفر حضرت مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب چشتی قادری پھلواروی کی ہمراہی میں بہاولپور کا ہوا جبکہ وہاں نواب مرحوم کی مسند نشینی کا جشن تھا (نواب مرحوم سے مراد موجودہ نواب صاحب کے والد صاحب ہیں) حضرت مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواروی مجھ سے اپنے فرزند کی طرح محبت رکھتے تھے۔ اور قومی جلسوں کا تعارف سب سے پہلے انہوں نے کرایا تھا۔ چنانچہ اس سفر بہاولپور کے بعد ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے سالانہ جلسہ منعقدہ بمبئی میں وہی مجکو اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ اور انہی کی معیت میں اسی سال مدراس کے جلسہ ندوۃ العلما میں شرکت ہوئی تھی۔ حضرت شاہ صاحب کے مجھ پر اتنے کثیر احسانات ہیں جنکو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

سفر بہاولپور میں سب سے پہلی بار شیخ عبد القادر صاحب سے ملاقات ہوئی جو اس زمانہ میں اخبار و اسٹیج کے آفتاب بنے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے مجکو دیکھکر کہا کہ شیخ محمد اقبال صاحب کا خیال تھا کہ حسن نظامی بہت بڑے آدمی ہیں اور میں کہتا تھا کہ وہ نوعمر ہیں۔ آج دیکھ کر مجکو اپنے اندازہ کی تصدیق ہو گئی کہ وہ صحیح تھا۔

اس سفر کے بعد چوتھا سفر پنجاب کا وہ تھا جس کا ذکر ابھی کیا گیا اور امرتسر میں زیادہ قیام ہوا تھا۔ اس سفر میں شیخ محمد اقبال سے کئی ملاقات ہوئی۔ اور پنجاب کے

قومی خیالات کا ایک گہرا اثر لے کر میں دہلی واپس آیا۔

میرزا قادیانی کی ملاقات امرتسر کے اسی زمانہ قیام میں قادیان کا سفر بھی ہوا اور میرزا غلام احمد صاحب و حکیم نورالدین صاحب اور مولوی عبدالکریم صاحب اور مولوی محمد علی صاحب وغیرہ بزرگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ مگر میرزا صاحب کا کچھ اچھا اثر مجھ پر نہ پڑا اور قادیان کے خلاف سب سے پہلا مضمون میں نے لکھا۔

مولانا شبلی مولانا ابوالکلام۔ تیرتھ یاترا کے زمانہ میں چند روز مسلسل لکھنؤ میں مولانا ابوالکلام کے ہمراہ رہنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا اس زمانہ میں رسالہ الندوہ کے ایڈیٹر تھے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء واقع گولہ گنج کے ایک کمرہ میں رہتے تھے۔ میں انہی کے کمرہ میں ان کے ساتھ عرصہ تک ٹھیرا رہا۔ اور مولانا شبلی مرحوم کی صحبتوں سے فیض اٹھائے۔ مولانا سید سلیمان ایڈیٹر رسالہ معارف اس زمانہ میں کم سن اور طالب علم تھے۔ اسی زمانہ سے میری اور مولانا ابوالکلام کی بے تکلفانہ دوستی ہو گئی۔

رزق کی تنگی کے اسی عہد میں ایک دفعہ بہاولپور جانا ہوا۔ جو دہلی کے چند اخبار نویس دوستوں کی تحریک سے ہوا تھا۔ بہاولپور میں نواب صاحب کی سالگرہ کے جشن میں اخبار نویسوں کو کچھ انعام ملا کرتے تھے۔ اور دہلی کے اخبار والے بھی وہاں جایا کرتے تھے۔ مجھکو بھی اس خیرات کے لئے آمادہ کیا گیا۔ اور میں وہاں گیا۔ مگر میرا نہ کوئی اخبار تھا نہ میں شاعر تھا جسکی بنا پر مجھے کچھ ملتا۔ شہزادہ میرزا محمد اشرف صاحب بی اے دہلوی کے نام جو وہاں ایک افسر تھے (اب بھی اسی ریاست میں افسر ہیں) شہزادہ میرزا امیر الملک صاحب کا خط لے گیا تھا جسکی بدولت ایک وقت شہزادہ صاحب نے اپنا مہمان بنایا مگر دوسرے وقت کہدیا کہ سرائے میں جا کر

ٹھیرے ۔ چنانچہ میں نہایت ذلت سے ریاست کی سرائے میں آن پڑا ۔ جہاں اخبار والوں اور شاعروں کے ساتھ چند دن گزارے ۔ اور سخت تکلیف و رسوائی کے بعد بے مراد گھر کو واپس آیا ۔

ہمراہیوں نے کہا کہ ہم قصیدہ تمہارے نام سے لکھدیتے ہیں وہ پیش کردو یا کسی فرضی اخبار کے ایڈیٹر بن جاؤ ۔ مگر میں نے اسکو قبول نہ کیا ۔ اور نہیں کہہ سکتا کہ میرے ضمیر پر اس سفر نے کیسی کیسی قیامت ڈھائی اور مجکو یہ سفر کتنا بے غیرتی کا سفر معلوم ہوا ۔

آج خدا کے فضل سے وہ زمانہ ہے کہ مولانا رحیم بخش صاحب مدارالمہام بہاولپور اور بعض سرداراکین ریاست مجکو بہاولپور آنے کی دعوت دیتے ہیں اور مجکو جانے کی فرصت نہیں ملتی ۔ یا وہ وقت تھا کہ میں ایک بھیک مانگنے والے کی حیثیت سے وہاں گیا ۔ اور سرائے میں پڑا رہا تھا ۔ اور اخبار والوں اور شاعروں کے ساتھ چند روپے حاصل کرنے کے لیے میں نے در بدر کے دھکے کھائے تھے ۔ آج وہی شہزادہ میرزا محمد اشرف میرے دوست ہیں اور مجکو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جنھوں نے ایک وقت سے زیادہ (بوجہ مجبوری ملازمت جمیں سائلوں کا مہمان کرنا جایز نہ تھا) مجکو اپنے گھر میں رہنے نہ دیا تھا ۔

اس واقعہ میں نصیحت ہے نااہل سائلوں کے واسطے ۔ اپنی ذات پر بھروسہ کرنا اور اپنی معاش اپنی محنت سے کمانا ہزار عزتوں کی ایک عزت ہے ۔ اور دوسرے کا محتاج بننا ۔ یا دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلانا لاکھ ذلتوں کی ایک ذلت ہے ۔

کیسی ہی تنگ دستی اور مفلسی ہو دوسرے کے دروازہ پر سوال نہ کرو اور محنت مزدوری کر کے مفلسی سے لڑو ۔ کسی پیشہ اور محنت سے نہ شرماؤ کہ اپنے ذاتی کام میں کچھ بے غیرتی نہیں ہے ۔

بزرگوں نے کہا تھا طمع کے تین حرف ہیں اور تینوں خالی ہیں۔ میں نے اس سفر میں اسکو آزمایا۔ اور طمع کو بالکل خالی پایا یہی وجہ تھی کہ اتنے طولانی سفر سے خالی ہاتھ واپس آیا اور راستہ کے خرچ کے لیئے جو قرض لے کر گیا تھا وہ مدت کے بعد ادا ہوا۔

اگرچہ طمع کے سبب میں بہاولپور نہ گیا تھا۔ کیونکہ طمع اسکو کہتے ہیں کہ انسان کے پاس موجود ہو اور پھر زیادتی کی خواہش کرے میرے پاس اس زمانہ میں کچھ موجود نہ تھا۔ اور میں طمع سے نہیں بلکہ ضرورت سے مجبور ہو کر بہاولپور گیا تھا مگر قدرت نے مجکو سبق دیا کہ کیوں محنت نہ کی اور مفت کی آمد کا خیال کیا۔ اسکی سزا یہ ملی ۔

مزدوری کی خوشی

اسی سلسلہ میں یہ واقعہ درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب میں کتابوں اور دہلی کی عمارات کے نقشوں کی تجارت کرتا تھا۔ اور دہلی دربار دسمبر ۱۹۰۳ء) کے موقع پر بیس سیر کا بوجھ سر پر رکھ کر کیمپوں میں فروخت کرتا پھرتا تھا۔ تو ایک خیمہ میں چند امیر مسافروں نے مجھ سے کچھ خریدا۔ اور حسن نظامی کو مجھ سے دریافت کیا۔ جس کا نام اخباروں میں مشہور ہو چکا تھا۔ میں نے ان سے یہ نہ کہا کہ میں ہی حسن نظامی ہوں۔ اور کہا درگاہ کے فلاں حجرہ میں حسن نظامی رہتا ہے آپ وہاں جائینگے تو ملاقات ہو جائے گی۔ چنانچہ دوسرے دن جب وہ لوگ میرے حجرہ میں آئے اور مجکو وہاں دیکھا اور یہ معلوم ہوا کہ میں ہی حسن نظامی ہوں تو ان کو بہت افسوس ہوا کہ میں اس قدر غریب و مفلس ہوں کہ اتنا بوجھ سر پر رکھ کر کوسوں کی منزل طے کرتا ہوں تو میں نے ان سے کہا کہ یہ بات افسوس کی نہیں ہے بلکہ خوشی کی ہے کہ میں اپنی روزی محنت سے مزدوری سے حاصل کرتا ہوں۔ بھیک نہیں مانگتا۔

اسوقت میرے دل میں ایسی خوشی کی لہریں تھیں جو بہاولپور کے مذکورہ سفر کی ذلت کے مقابلہ میں بادشاہی کی خوشی معلوم ہوتی ہیں۔

پیر بھائیوں کو چاہیئے کہ وہ بھی ہمیشہ اپنی روزی ذاتی محنت سے حاصل کریں

اور سوال یا سوالی کی قسم کی کسی عادت سے سروکار نہ رکھیں انہیں شرح کا انبساط فنائے محض ہو جاتا ہے۔

سفرِ بمبئی

سنہ ۱۹۰۷ء میں بمبئی کا سفر پیش آیا۔ جہاں مسلسل چار مہینہ ٹھیرنا ہوا۔ اسی سفر میں سب سے پہلے غلام نظام الدین قریشی۔ رضاء الحق عباسی وغیرہ احمد آبادی احباب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اور ان کے ہمراہ رات دن کی بے تکلف صحبتوں میں وقت گزرا۔ غلام نظام الدین قریشی پہلے شخص تھے جنہوں نے اس آزادی و رندی کے زمانہ میں مجھ سے مرید ہونے کی درخواست کی۔ حالانکہ اس زمانہ میں نہ نماز کی پابندی تھی نہ روزہ کی۔ نہ کچھ اور حالات ایسے تھے جن سے ان کو بیعت کی رغبت ہوتی۔ مگر یہ ایک قلبی مناسبت کا اثر تھا۔ جو ازل سے میرے اور قریشی کے دل میں تھی۔ یہ نوجوان پارٹی بہت آزاد خیالی اور خوش باشی کی زندگی بسر کرتی تھی۔ اور مذہبی امور کا ذکر محض قومی اور سیاسی حیثیت سے انہیں ہوتا تھا جیسا کہ آجکل انگریزی داں جوانوں میں ہوتا ہے مگر خدا کی شان ہے کہ ان سب رندانِ خراباتی کی پارٹی ایک دن میری مرید ہو گئی۔ اور ایسی مرید ہوئی کہ آج میں ان کے خلوص و ربط قلبی پر فخر کرتا ہوں۔

بمبئی میں میرا جو حال تھا وہ میں حسب عادت ہو بہو روزنامچہ میں لکھدیا کرتا تھا۔ اور وہ روزنامچہ چھپ گیا ہے۔ اور مدت سے بکچکا ہے۔

اسی سفر کے دوران میں گجرات و کاٹھیاواڑ کا مفصل چکر لگایا جس کی پوری کیفیت روزنامچہ میں مذکور ہے۔

سنہ ۱۹۰۸

سے ۱۹۱۳ء تک سفر بمبئی سے واپس آکر دہلی میں رہنے لگا۔ مضامین نویسی اور تجارت کتب کا مشغلہ جاری تھا۔

اسی زمانہ میں ایک صاحب کا خط میرے نام دہلی سے آیا جس میں انہوں نے اپنی بیوی کے خواب کی تعبیر پوچھی تھی۔ میں نے اسکا جواب دیا۔ کچھ دن کے بعد

ایک فیشن ایبل نوجوان صاحبزادے چاندنی چوک میں محمد میرزا صاحب آئینہ فروش کی دکان پر ملے۔ اور معلوم ہوا کہ خط انہوں نے بھیجا تھا۔ اور ان کا نام سید محمد ارتضیٰ ہے۔ والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ عربک اسکول میں پڑھتے ہیں۔ ان کو اخبارات کا بہت شوق تھا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ اور خادم تخلص تھا۔

اس تعارف کے بعد ایک دن وہ مجھ کو بازار میں پھر ملے۔ میں نے دیکھا کچھ غمگین یا افسردہ ہیں۔ سبب پوچھا۔ تو معلوم ہوا انٹرنس کے امتحان میں فیل ہو گئے ہیں۔ میں نے ان کو تسلی دی۔ اور اپنے ہمراہ پنچ قبر کی قیام گاہ پر لے گیا۔ جہاں میں مستقل طور سے رہتا تھا۔ مکان پر آکر میں نے ان سے زندگی کی کامیابی و ناکامی پر بہت سی باتیں کیں۔ اور اپنی ہمدردی کا اظہار کیا کہ وہ خوش ہو کر واپس گئے۔ اسکے بعد انہوں نے میرے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ اور مجھ کو ان کے محبانہ برتاؤ سے ایک طرح کی وابستگی ہو گئی۔ اگر وہ نہ آتے تو میں راہ دیکھتا۔ اور آجاتے تو خوش ہوتا۔ رفتہ رفتہ تعلقات اتنے بڑھے کہ انہوں نے اسکول کی تعلیم چھوڑ دی۔ اور رسالہ نظام المشائخ جاری کرنے میں میرے شریک ہو گئے۔ یہ حلقہ المشائخ قائم کرنے کا زمانہ تھا۔ اور رسالہ اسی کے مقاصد کی اشاعت کے لیے نکالنا تجویز ہوا تھا۔

اہلیہ کے انتقال اور علالت شدید اور مخالفتوں کے طوفان کے بعد میں کلکتہ چلا گیا۔ اور سید محمد ارتضیٰ صاحب نے میری عدم موجودگی میں رسالہ کے کام کو سنبھالا۔ واپس آیا تو سید صاحب نے میرے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور واحدی لقب حاصل کیا۔ اسکے بعد سے دنیا نے ان کو محمد الواحدی کے نام سے یاد کرنا شروع کیا۔ اور آج تک وہ اسی نام سے مشہور ہیں۔ **واحدی صاحب** کے ساتھ مسلسل پانچ برس یکجائی رہی۔ اور مجھ میں ان میں اتنی محبت ہوگئی جو میری ساری زندگی میں بے مثال مانی جائے گی۔ ایک جگہ رہنا ایک جگہ کھانا۔ ایک سا پہننا۔ ایک ساتھ بازار میں نکلنا۔ غرض ایک جان دو قالب کی طرح میرا ان کا یہ زمانہ بسر ہوا۔

میں ان کے بغیر ایک ساعت بسر نہ کر سکتا۔ اور وہ مجھ بن ایک لمحہ نہ گزار سکتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں جب مجکو سفر مصر و شام و حجاز میں جانا پڑا تو مجھ ہی پر یہ جدائی شاق نہ تھی واحدی صاحب نے بھی یہ ایام ایسی افسردگی میں کاٹے کہ دیکھنے والوں کو ہم دونوں کی محبت پر تعجب ہوتا تھا۔

واحدی صاحب بہت مغلوب الغضب۔ اور بہت ضدی طبیعت کے تھے۔ مجھ میں ان میں باوجود پیری مریدی کے تعلق اور نہایت بے انتہا محبت کے ناچاقی بھی ہوتی تھی اور وہ بعض اوقات اتنی بڑھ جاتی تھی کہ اگر دوسرے کو اس رنجش کا حال معلوم ہوتا تو وہ کبھی یہ نہ مانتا کہ ان دونوں میں پھر بھی میل جول ہو سکے گا۔ مگر دوسرے ہی دن ہم دونوں پھر ویسے ہی ایک ہو جاتے تھے۔ میرے مزاج میں تلون اور عجوبہ پسندی اور ملاقاتوں کا شوق حد سے زیادہ۔ ان کے مزاج میں آدم بیزاری۔ ضد، غصہ کی کچھ انتہا نہ تھی۔ مگر پانچ برس تک ان دو متضاد قوتوں نے یکجا ملکر کام کیا۔ اور ایسے ملاپ کی شان سے کیا کہ دوسرے حیران رہ گئے۔

یہی زمانہ میری اور انکی مستقل شہرت اور تجربے حاصل کرنے کا تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۹ سنہ ۱۹۱۰ بڑے لطف و اتحاد سے گزرے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں سفر مصر و شام سے واپس آیا تو پھر واحدی صاحب کے ساتھ رہنے لگا۔

واحدی صاحب کی نسبت آجکل میری یہ رائے ہے جبکہ وہ نظام المشائخ اور رسالہ خطیب و درویش پریس کے مالک اور ایک شاندار عملہ اور کروفر کے دفتر کے افسر ہیں کہ اب انمیں پہلے کی نسبت زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ لوگوں سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے ہیں ضد اور غصہ میں نمایاں فرق ہو گیا ہے۔ اور قوم و ملک کے مسائل کو لیڈروں کی طرح سمجھتے ہیں۔ اور دماغی قوت اتنی اچھی ہے کہ ہر معاملہ کے نیک و بد پر عاقلانہ دور اندیشی کی صحیح رائے دے سکتے ہیں۔ اور میری نگاہ میں خصوصیت پہلی جیسی تام و کمال

نہیں تو تمام دنیا کے لوگوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ ہے۔ تاہم میں ان کو عقیا نہیں سمجھتا کیونکہ انہوں نے تجارت سیکھ لی ہے۔ میری انشا پردازی کی وراثت حاصل نہیں کی۔ جسکے ارمان کو قبر میں لیکر جاؤنگا۔

میں ان کو محبت کے دوستوں میں سب سے اول سمجھتا ہوں۔ اور انکے سوا اور کسی پر ناجائز خفا ہونے اور جلانے ستانے اور رنجیدہ کرکے خوش ہونے کی خواہش مجھکو نہیں ہوتی۔ نہ ان کے سوا مجھے کوئی اور نظر آتا ہے جو میرے ناز جا و بیجا اٹھالے۔

دنیا کو انکی زندگی ایک تاجر کی سی معلوم ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ واقعی وہ حد سے بڑھکر تاجر ہوگئے ہیں۔ پھر بھی جو شریف پروری اور وضعداری اور سچ بولنے کی عادت ان میں ہے وہ بہت کم تاجروں میں پائی جائے گی وہ بہت زیادہ سچے ہیں اور کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ مگر مجھ سے بہت کم سچ بولتے ہیں۔ اور میں خوش ہوں کہ جھوٹ کی تخصیص بھی انہوں نے میرے واسطے مخصوص کردی ہے جسمیں اور کوئی شریک نہیں ہے۔

۱۹۱۳ء

اس سنہ میں میرٹھ سے اخبار توحید کا جاری کرنا اور وہیں جاکر رہنا سب سے بڑا واقعہ ہے۔ میرٹھ کے مشہور خاندان خان بہادر شیخ الٰہی بخش صاحب اور ان کے بھائی خان بہادر حافظ عبدالکریم صاحب سی آئی ای سے ہندوستان میں اکثر مسلمان واقف ہیں۔ غدر ۱۸۵۷ء کے ہولناک زمانہ میں انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ بڑے بڑے احسان کئے تھے۔ اور عوام میں مشہور ہے کہ جامع مسجد دہلی کے واگذاشت کرانے اور فوجی قبضہ انگریزی سے چھڑا کر مسلمانوں کے حوالہ کرنے میں بڑی جانفشانی اور خرچ برداشت کیا تھا۔ دہلی میں شہرت ہے کہ جامع مسجد میرٹھ والوں نے چھڑائی اور لاکھوں روپے اس کام میں خرچ کردیے۔ اس شہرت کی اصلیت کچھ ہی ہو مگر اسمیں شک نہیں کہ حافظ صاحب اور ان کے خاندان نے مسلمانوں کے ساتھ خفیہ و علانیہ بہت سلوک کیا ہے اور حکام انگریزی میں اس خاندان کی عزت امتیاز خاص سے پائی جاتی ہے۔ مرحوم حافظ صاحب مدتوں تک

حقیقی نواسہ اور موجودہ رئیس خاندان خان بہادر شیخ وحید الدین صاحب کے بھانجے اور داماد مولوی شیخ احسان الحق صاحب جو ایک ہونہار اور تعلیم یافتہ جوان تھے میرے میرٹھ جانے اور رہنے کے باعث ہوئے۔ اور اخبار توحید انہی کے خرچ سے جاری ہوا۔

شیخ احسان الحق صاحب کئی برس سے ملتے جلتے تھے۔ اور نظام المشائخ کے خریداروں میں سب سے پہلا نام ان کا تھا۔ وہ عربی اور انگریزی کے ایف اے تک تعلیم یافتہ تھے اور مجھکو انمیں محبت و اخلاص کی سب سے زیادہ نمایاں شان نظر آتی تھی۔

ابتدا سے مجھکو اس بات کی دھن رہتی تھی کہ میری طرح اور لوگ بھی اردو کی انشا پردازی سیکھیں۔ چنانچہ واحدی صاحب کے علاوہ بہت سے نوجوانوں کو تقریر و تحریر کا شوق دلایا کرتا تھا۔ اور جس شخص میں ذرا سا مادہ انشاپردازی کا دیکھتا تو بہت زیادہ متوجہ ہو کر اسکو مشق کی رغبت دلاتا تھا۔ سیوہارہ ضلع بجنور کے مقبول احمد نظامی فطرتی عمرت کے زمانہ میں برسوں میرے ساتھ رہے۔ یعنی جب میری حالت مفلسی کی تھی تو انہوں نے کئی برس میری خدمت کی۔ اور رات دن میرے ساتھ رہے۔ ان کو بھی لکھنے کی تاکید کرتا تھا۔ انہوں نے ایک حد تک میری تقلید میں لکھنے کی مشق بہم پہونچائی تھی۔ اسی طرح اور چند نوجوان ہیں جو آجکل مضامین نویسی میں پورے مشاق ہو گئے ہیں۔

شیخ احسان الحق صاحب کے ساتھ رہنے کو میں نے اس وجہ سے بھی قبول کر لیا کہ مجھکو ایک تعلیم یافتہ جوان میں ادبی قابلیت پیدا کرنے کا شوق تھا۔ اور میں ان میں اسکی بہت صلاحیت پاتا تھا۔

اخبار توحید جس شان سے نکلا۔ اور پانچ مہینے کی زندگی میں جو مقبولیت اس نے حاصل کی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ہفتہ وار اخبار لکھنے کا میرے واسطے یہ پہلا موقع تھا۔ مگر خدا کا شکر ادا کیا کہ اسکے فضل سے میں اس کوشش میں اپنے تمام ہم عصروں سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔ بلحاظ سادگی۔ جدت مضامین۔ اور انشاپردازی کے اسلامی خدمات

میں کوئی اردو اخبار نہ تھا۔ مگر افسوس ہے کہ کہو تکبیر والی تقریر چھاپنے کے جرم میں سر جیمس مسٹن لفٹیننٹ گورنر ممالک متحدہ کی گورنمنٹ نے اسکو جبراً بند کرادیا۔

اخبار توحید کے سلسلہ میں جو مشکلات حکومت کی طرف سے میری ذات کو پیش آئیں اور جو نقصانات شیخ احسان الحق صاحب نے برداشت کئے ان کے اسباب اس قسم کے ہیں جن کا شائع کرنا بعض دلوں کو رنجیدہ کریگا۔ اسواسطے ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے اس موقع پر محمد انوار صاحب ہاشمی کا ذکر کرنا ضروری ہو جو اخبار توحید کے منتظم کل اور بھیا احسان کے قوت بازو اور میرے معاون خصوصی تھے۔ اور جنکی قابلانہ محنتوں سے اسوۂ حسنہ وغیرہ رسالے ظاہر ہوئے اور جو آجکل بھیا احسان کی روح رواں ہیں۔

کہو تکبیر میری ایک تقریر کا عنوان تھا۔ جو کانپور کی مسجد اور وہاں کے مسلمان مقتولوں مجروحوں قیدیوں کی حمایت میں جامع مسجد میرٹھ میں جمعہ کے دن ہوئی تھی۔ اور جو ہندوستان میں ایک کروڑ سے زیادہ شائع ہوئی۔ کیونکہ ہر صوبہ کے مسلمانوں نے اسکی لاکھوں کاپیاں چھپواکر دیہات میں تقسیم کرائی تھیں۔ اور اردو کے تمام اخبارات نے اسکو چھاپا تھا۔

ہندوستان میں شاید کوئی مذہبی تقریر اتنی مقبول نہ ہوئی ہوگی۔ اور اس نے یہ اثر پیدا نہ کیا ہوگا جو کہو تکبیر کو خدا نے دیا۔ وہ عربی و ترکی اخبارات میں حواشی و رائے زنی کے ساتھ شائع ہوئی۔ اور قسطنطنیہ کے ایک دوست نے اس زمانہ میں مجکو لکھا تھا کہ تمہاری تقریر کہو تکبیر کا ترجمہ پڑھ کر

انور پاشا بہت خوش ہوئے اور اسکی تعریف کی۔

ہندوستان کے ہزاروں آدمیوں نے اسکو حفظ یاد کر لیا تھا۔ اور شاید اب بھی کچھ آدمی ایسے ہونگے جنکو وہ یاد ہو۔

اس تقریر کی بنا پر بعض علاقوں میں میرا نام کہو تکبیر رکھدیا گیا۔ چنانچہ اسکے بعد جب

بانکی پور کے جلسہ میں گیا تو ہزاروں آدمی میرے موٹر کے ساتھ تکبیریں پڑھتے تھے۔ اور کہو تکبیر کہو تکبیر کے نعرے لگاتے تھے۔

سر جیمس مسٹن لفٹنٹ گورنر جنہوں نے اس تقریر کی ضبطی کا سب سے پہلے حکم دیا تھا اسی تقریر کی بنا پر اپنے ملنے والوں سے جب میرا کچھ ذکر کرتے تو یوں کہتے تھے۔ کہیے آپکے دوست کہو تکبیر کا کیا حال ہے۔ یعنی حسن نظامی نام نہ لیتے تھے اور کہو تکبیر سے اُنکو یاد کرتے تھے۔

اس تقریر کی ضبطی تمام ہندوستان میں ہوئی۔ اور جن جن اخباروں نے اسکو چھاپا تھا عموماً وہ بھی ضبط کر لیے گئے۔ گجرات کا اسلامی اخبار پولیٹکل ہیومیو بھی اسی تقریر کے ترجمہ گجراتی چھاپنے پر حکماً بند کرا دیا گیا۔

حیدرآباد کے ایک بڑے مسلمان افسر سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایش کی کہ کہو تکبیر والی تقریر اپنی زبان سے سنا دیجیے تاکہ میں فخر کروں کہ خود اس کے مصنف سے میں نے اسکو سنا ہے۔

زندگی میں موت

مجکو اپنی زندگی میں دو مرتبہ موت کی خبر سننے کا موقع ملا۔ ایک تو خاندان کے کسی دشمن نے اخبار وکیل امرتسر۔ وطن لاہور۔ پیسہ اخبار لاہور کو لکھدیا تھا۔ جسپر ان اخبارات نے بڑے بڑے نوٹ تعزیت کے لکھے تھے۔ اور میرے احباب میں بڑی تشویش اس سے پیدا ہو گئی تھی۔

اور دوسرا واقعہ میرٹھ میں پیش آیا۔ کہو تکبیر کی تقریر کے زمانہ میں ۲۴ر اگست کو ایک بڑے بلوہ کا اندیشہ میرٹھ میں کیا جاتا تھا۔ اور چونکہ باشندگان شہر میں ہر شخص کو یہ خیال تھا کہ میں ۲۴ر اگست کو میرٹھ میں فساد کراؤنگا اور حکام بھی اس شہرت سے انتظامات میں مصروف تھے اسلیے ۲۴ر اگست کے دن جبکہ شہر میں فوجیں اور توپ خانے گشت کر رہے تھے کسی شریر نے دہلی میں مشہور کر دیا کہ میرٹھ میں بلوہ ہو گیا۔ اور حسن نظامی اسمیں مارا گیا۔

سب سے پہلے یہ خبر صدر بازار دہلی سے کسی شخص نے دفتر اخبار کامریڈ کو رات کے وقت بذریعہ ٹیلیفون دی۔ مسٹر محمد علی اور مسٹر شوکت علی اسوقت تراویح پڑھنے مسجد میں گئے ہوئے تھے۔ ان کو یہ خبر مسجد میں پہنچائی گئی۔ اور طرفۃ العین میں ہزاروں مسلمان جمع ہوگئے۔ اور اس خبر پر رائے زنی ہونے لگی۔ بعض جوشیلے لوگ انتقام کی صلاح دیتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ اسی وقت دہلی میں ہنگامہ کر دینا چاہیئے۔ مگر مسٹر محمد علی شوکت علی نے احتیاط و صبر سے کام لیا۔ اور واحدی صاحب سے دریافت کیا گیا۔ ان کو کچھ خبر نہ تھی۔ تاہم انہوں نے کہا میں ابھی میرٹھ جا کر اس قصہ کی تحقیقات کرتا ہوں۔

یہ بڑے امتحان کا وقت تھا۔ ہر شخص کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ خطرہ میں پڑے اور میرٹھ جائے۔ واحدی صاحب کے رشتہ دار ان کو روکتے تھے کہ تم آدھی رات کو وہاں نہ جاؤ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب تم اپنے آپ کو کیوں بلا میں پھنساتے ہو۔ مگر واحدی صاحب کی محبت مرتے دم تک مجھکو یاد رہے گی کہ انہوں نے کسی مشورہ کی پروا نہ کی۔ اور بارہ بجے کی ریل میں سوار ہو کر دو بجے میرٹھ پہنچے۔ اور سحری کے وقت مجھکو میرٹھ میں جا کر جگایا۔ وہ مجھکو اسطرح جھک جھک کر دیکھتے تھے کہ میں وہی حسن نظامی ہوں جو ان کے ساتھ ۵ برس تک رہا۔ یا کوئی دوسرا آدمی ہے۔ اور انکی آنکھیں غلطی کر رہی ہیں۔ میں حیران تھا کہ وہ اپنی متانت و سنجیدگی کے خلاف یہ کس قسم کی حرکتیں کر رہے ہیں۔

کیونکہ مجھکو اصل واقعہ کی کچھ خبر نہ تھی۔ آخر قصہ معلوم ہوا تو کچھ دیر بہت لطف رہا اور صبح کی گاڑی میں واحدی صاحب دہلی واپس گئے تاکہ دہلی والوں کو مطمئن کریں۔

انہوں نے دہلی آکر عام اعلان کر دیا۔ اشتہار بھی تقسیم کئے اور زبانی بھی کہا کہ فساد میرٹھ اور قتل حسن نظامی کی خبر غلط ہے۔ تب بھی ہزاروں آدمیوں کو یقین نہ آیا۔ اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ بلوہ ضرور ہوا ہے کسی مصلحت سے اسکو چھپایا جاتا ہے۔

گھر میں ماتم کی صف ۔ واحدی صاحب کو شہر کے ہجوم اور ہلچل میں اسکی فرصت

نہ ملی کہ میرے گھر میں خیریت کی خبر بھیجتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری لڑکی حور بانو کو میرے مارے جانے کی خبر پہونچی۔ اور اس بے ماں کی بچی نے رونا شروع کیا۔ خاندان کے دشمنوں کو بھی اس لڑکی سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اور ہندو مسلمان عورت مرد سب جمع ہو کر ماتم داری کرنے لگے۔ آدھی رات تک روزے افطار کرکے کسی نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ آخر حور بانو کے خالو پیرزادہ سید محمد صادق صاحب چند قرابت داروں کے ساتھ اسی رات والی ریل میں میرٹھ آئے اور دو بجے پھر مجھکو جگایا گیا۔ اس دفعہ میں خود ان کے ہمراہ دہلی آگیا اور کھلی بگھی میں سوار ہو کر سارے شہر میں پھرا تاکہ سب لوگ دیکھ لیں اور مطمئن ہو جائیں۔ مجھے ہنسی آتی تھی جب خلقت قریب ۲۲ اکر مجھکو دیکھتی تھی۔ شاید اسکو شبہ ہوگا کہ حسن نظامی کا بناوٹی پتلا گاڑی میں بٹھا دیا گیا ہے۔

جسوقت میں اپنے گھر میں آیا ایسا جوش خوشی کا میں نے لوگوں میں دیکھا جسمیں دوست دشمن سب شریک تھے جسکا اظہار الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ صدقے دیے گئے۔ نیازیں دلوائی گئیں اور حور بانو مجھسے لپٹ کر خوشی کا رونا روئیں۔

میرٹھ کے قیام کی مختصر زندگی میں بڑے بڑے واقعات پیش آئے۔ اور احباب کا خیال ہے کہ تحریر کا جو زور اور اثر میرٹھ کے قیام میں پایا گیا وہ نہ پہلے تھا نہ بعد میں باقی رہا۔ اسکے اسباب کچھ بھی ہوں مگر میرا خیال یہ ہے کہ میرٹھ کی آب ہوا مجکو بہت موافق تھی۔ اور میں نے جو کام وہاں کیا پوری تندرستی کی حالت میں کیا۔

شیخ احسان الحق صاحب سے جدا ہو کر دہلی آیا تو پھر حامدی صاحب کے پاس نہ ٹھیرا بلکہ اپنے قدیمی گھر یعنی درگاہ حضرت محبوب الٰہی میں آکر رہنے لگا۔ شیخ صاحب جنکو لوگ بھیا کہتے ہیں۔ اور میں بھی بھیا احسان کے نام سے انکو پکارتا ہوں توقع سے زیادہ ذہین ثابت ہوئے۔ توحید اخبار کے زمانہ میں وہ کچھ کم علم ذکر کرتے تھے۔ نہ انکو مضمون لکھنے کی عادت تھی تاہم ذہنی اور دماغی قابلیت خاص تھی

کہ وہ مجکو لکھنے میں مشورے دیتے تھے اور بعض خاص موضوع مضامین کے تجویز کرکے مجھسے ان پر لکھواتے تھے۔ چنانچہ نعت کے موثر مضامین۔ موت کے مضامین۔ بزرگوں کی قبروں کی لوحیں انہی کے کہنے سے میں نے لکھیں اور کامیاب ہوا۔ اس اعتبار سے وہ میرے معنوی استاد ہیں۔ اور میں نے ان کو لکھنے کا طریقہ بتایا اور زور دے دیکر لکھوانا شروع کیا۔ بعد اس لحاظ سے میں ان کا استاد ہوں۔ اب وہ مذہبی۔ اصلاحی۔ اور تنقیدی رنگ کے بہت اچھے اور زوردار مضامین لکھ سکتے ہیں۔ انکی تحریریں فلسفیانہ جدت اور بے مروتی و بے رعایتی ہوتی ہے۔ بے مروتی و بے رعایتی کا مطلب یہ ہے کہ وہ رائے زنی کرنے میں کسی بزرگ یا دوست یا تعلق والے کی پاسداری نہیں کرتے اور بے لاگ لکھتے ہیں۔ انکی نظر کتاب یا زیر بحث چیز کے حسن و قبح پر بہت گہری جاتی ہے۔ اور کبھی ان کو کھوٹے کھرے کے پرکھنے میں ناکامی نہیں ہوتی۔ وہ اردو زبان میں سب سے پہلے نقاد ہیں جنہوں نے تحریروں کے عیب و ہنر کو اصلیت کی شان سے دکھانا شروع کیا۔ ورنہ پہلے صرف تعریف کردینے کا نام ریویو و تنقید تھا۔

میرٹھ آنے کے بعد انہوں نے میرٹھ سے ماہوار رسالہ اسوۂ حسنہ جاری کیا۔ اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم پر زور دیکر عصر جدید میں بھی جان ڈالی۔

اسوۂ حسنہ مذہبی اصلاحی رسالہ تھا۔ اور عصر جدید تمدنی اصلاح کا آرگن اسوۂ حسنہ میں ان کو بہت کامیابی ہوئی اور تھوڑے عرصہ میں اسکی اشاعت ہزاروں تک پہنچی۔ مگر عصر جدید کی اشاعت زیادہ نہ بڑھ سکی۔ اور خواجہ غلام الثقلین کی ناگہانی وفات کے سبب اسکو بند کرنا پڑا۔

بھیا احسان میرے مرید نہیں ہیں۔ مگر مریدوں سے بڑھکر ادب و محبت پیش آتے ہیں۔ ادب و اخلاق کی ایک منکسرانہ شان جو ان کے خاندان کی مخصوص صفت ہو اول وقت سے آجتک انمیں موجود ہے۔

ان کے خاندان کا ایک خاص لباس اور عاجزانہ و مؤدبانہ ملنا جلنا - بزرگوں کا رکھ رکھاؤ ایسی چیزیں تھیں جنکو اس خاندان کا ٹریڈ مارک کہنا چاہیئے مگر افسوس ہو کہ اب لباس کی خصوصیت نوجوان پارٹی سے رخصت ہوتی جاتی ہے البتہ حسن ادب اور شائستہ و ملنسار طرز ملاقات ابتک ہر ممبر خاندان میں موجود ہے۔

ایک جگہ رہنے اور بے تکلفانہ زندگی بسر کرنے سے رشتۂ ادب کا محفوظ رہنا ناممکن سمجھا جاتا ہے - اور میں نے اپنے بڑے بڑے باادب مریدوں کو دیکھا کہ جب میں نے انکے ساتھ بے تکلفانہ برتاؤ کیا تاکہ خودی بزرگی کی غیریت دور ہو جائے تو وہ عموماً حد احترام سے متزلزل ہو گئے - مگر بھیا احسان کا یہ کمال ظاہر کرنے کے قابل ہے کہ وہ سالہا سال کی بے تکلفانہ نشست برخواست میل جول - بات چیت کے باوجود ایک لمحہ کو بھی حد ادب سے ایک قدم ادھر ادھر نہ ہوئے - اور لطف یہ ہو کہ میری بے تکلفی و یکدلی کا جواب بے تکلفی و یکدلی سے دیتے رہے اور ملت کو غیر شگفتہ نہ ہونے دیا۔

میرا خیال ہے یہ انکی ذاتی خوبی نہیں ہے بلکہ خاندانی سوسائٹی کی تربیت کا اثر ہے جس سے طفلی میں ان کا کیرکٹر بن گیا تھا۔

اب بھیا احسان دہلی میں آ گئے ہیں - اور ان کا جسم بھی دل کے ساتھ ہی میرے قریب رہتا ہے۔

واحدی صاحب اور بھیا احسان کے فرق تعلق کو بیان کرنا آسان نہیں ہے میں نہیں چاہتا کہ آئندہ نسلوں کو ان دونوں کی صورت دو رقیبوں کی شکل میں دکھاؤں جیسا کہ بعض اوقات آجکل لوگ قیاس دوڑایا کرتے ہیں - مجھکو جو تعلق واحدی صاحب سے ہے وہ بھیا احسان سے قیامت تک نہیں ہو سکتا - اور بھیا احسان کو جیسا مجھکو سمجھنا اور برتنا اور دل لینا اور دل دینا آتا ہے اس سے واحدی صاحب حشر تک آگاہ نہیں ہو سکتے۔

میں ان دونوں کو اپنا سمجھتا ہوں اور یہ دونوں میرے سوا بہت کم لوگوں کو اپنا سمجھتے ہیں۔

بھیا احسان اور واحدی صاحب کی علمیت میں بیشک فرق ہے۔ مگر قابلیت اور دماغی جوہر دونوں کے مجھ سے زیادہ ہیں۔ بعض باتوں میں واحدی صاحب زیادہ ہیں بعض میں بھیا احسان بڑھ کر ہیں مگر میری محبت کے نکتہ پر دونوں کا اتحاد ہے۔ اور دونوں میری ادبی اور خیالی و عملی زندگی کو فروغ دینا اور زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

اختلاج کا مرض دونوں کو ہے۔ دلیری اور بے خوفی ایک میں بھی نہیں ہے۔ میں اپنے جبلی ولولہ سے بے خوف نڈر ہوکر بے سوچے سمجھے جو کام کر جاتا ہوں وہ ان کو پہلے سے معلوم ہو جائے تو یہ کبھی مجھکو اسکی طرف بڑھنے کی اجازت نہ دیں۔ انکی احتیاطوں نے مجھکو بودا کر دیا ہے۔ لیکن مجھے اقرار کرنا چاہیے کہ اگر ان دونوں کی احتیاطیں اور خاکسار صاحب کی سرپرستی مجھکو مقید نہ رکھتی تو میں یا تو پھانسی پا چکا ہوتا اور یا نظر بندان ہند کے ساتھ کسی جگہ قید ہوتا۔

مجھے امید ہے کہ میرے مرنے کے بعد میرے کاموں۔ میری تحریروں اور میری خصوصیات کی فراہمی اور ترتیب بھیا احسان کے ہاتھ سے ہوگی۔ اور اسکو عام اشاعت دینے اور رنگ برنگ طریقوں سے پھیلانے اور پائدار و موثر کرنے کا فرض واحدی صاحب کے ہاتھوں سے ادا ہوگا۔

سنہ ۱۹۱۳ء سے سنہ ۱۹۱۹ء تک

میرٹھ سے واپس آکر درگاہ میں قیام کیا گیا اور اسی قیام نے آٹھ برس ختم کر دیئے۔

آٹھ سال۔ اللہ اکبر زندگی کا ایک بڑا حصہ ہے خبر نہیں کہاں۔ اور کیونکر چلے گئے اس زمانہ کا خلاصہ احوال یہ ہے کہ کتابیں لکھیں۔ شادی کی بچے ہوئے۔ ہندوستان بھر کے چکر لگائے۔ جنگ یورپ کی بہار دیکھی۔ خفیہ پولس کے ہاتھوں سنہ ۱۹۱۴ء کے ستمبر تک طرح طرح کی

چھیڑ چھاڑ برداشت کی۔ خطوط پر سنسر (محتسب) مقرر ہوا۔ اور ستمبر ۱۹۱۸ء سے نگرانی پولیس کی دور ہوئی۔ رسالہ مرشد جاری کیا۔ وغیرہ۔ یہ تو مجمل خلاصہ تھا۔ اب تفصیل وار بعض حصوں کی تشریح سنیئے

سب سے پہلی تصنیف غالباً ۱۹۰۰ء کے شروع یا اسکے کچھ بعد مفلسی کے مجرب علاج کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اسکا ٹھیک زمانہ یاد نہیں ہے اگر تحقیق ہو سکا اور اس رسالہ کی پہلی اشاعت کا کوئی نمبر مل گیا تو لکھدیا جائے گا۔

یہ رسالہ حضرت مولانا جلال الدین سیوطی کے ایک عربی رسالہ کا ترجمہ تھا جس میں مفلسی دور کرنے اور تونگری حاصل ہونے کی دعائیں اور اعمال درج تھے۔

اس کا دیباچہ میرے نام سے حکیم عبدالستار صاحب لطفی دہلوی نے لکھا تھا۔ جو خاکسار صاحب کے دوست تھے۔

مجھے تجربہ نہ ہونے کے سبب امید نہ تھی کہ یہ رسالہ فروخت ہو سکیگا۔ مگر خاکسار صاحب کے کہنے سے چھپوالیا تھا۔ جسدن چھپ کر آیا۔ دو سو کا پیاں خیر مجسم حاجی محمد اسحٰق صاحب سوداگر صدر بازار دہلی نے خرید لیں۔ اور اسی طرح دیگر حضرات کی یکشت خریداری سے ایک ہفتہ کے اندر اسکی پہلی اشاعت ختم ہو گئی۔ اسکے بعد میں نے اسکا حق تصنیف خاکسار صاحب کو دیدیا۔ اور اب وہی اسکو چھاپتے رہتے ہیں مجھے معلوم نہیں کتنی مرتبہ چھپ چکا ہوگا۔ تاہم خیال ہوتا ہے کہ زیادہ ایڈیشن نکلے ہونگے کیونکہ اعمال کے شوقین لوگ اسکو بہت پسند کرتے ہیں (یہ رسالہ ایک جزو یعنی سولہ صفحہ کا ہے) قیمت ۱ر

دوسری تصنیف ۱۹۱۱ء میں سفر مصر و شام سے واپس آکر ظہور مہدی یعنی شیخ سنوسی حصہ اول کے نام سے دو جزو ۳۲ صفحہ کا ایک رسالہ لکھا جسمیں آیندہ زمانہ کے انقلابات اور پیشین گوئیاں امام مہدی کے ظہور کی متعلق تھیں یہ اللہ ایسا مقبول ہوا کہ پچاس ہزار کے قریب چھپ کر بکا۔ چھ دفعہ تو میں نے چھپوایا۔ اور بمبئی وغیرہ چند مقامات میں سارق تاجران کتب نے علیحدہ کئی مرتبہ چھاپ چھاپ کر فروخت کیا۔ اسکے گیارہ ہی حصے

ترجمے بھی کئی بار چھپ کر فروخت ہوئے۔

یہی رسالہ تھا جس کی ہر دلعزیزی اور فوری فروخت سے میری مالی حالت درست ہوئی اور دوسری کتابیں لکھنے کی طرف راغب ہوا۔ قیمت ۵؍

تیسری تصنیف اس رسالہ کا دوسرا حصہ کتاب الامر عرف امام مہدی کے انصار کے نام سے شائع ہوا۔ یہ چار جزو یعنی ۶۴ صفحہ کا تھا۔ اور اس میں بھی پہلے حصہ کی طرح پیشین گوئیاں تھیں۔ اور پہلے حصہ میں شہنشاہ انگلستان کے مسلمان ہو جانے کی جو پیشین گوئی تھی اس دوسرے حصہ میں اسپر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ اور توریت۔ انجیل وغیرہ شاہ نعمت اللہ ولی کے اقتباسات دیئے گئے تھے۔

یہ کتاب بھی کئی بار چھپی (غالباً پانچ دفعہ) اور ہاتھوں ہاتھ بکی۔ اور اسکے بھی متعدد ترجمے گجراتی وغیرہ شائع ہوئے۔ قیمت ۴؍

یقین کی قوت ان رسالوں کے شائع کرنے کے وقت مجکو شہنشاہ انگلستان کے مسلمان ہونے کا اتنا یقین تھا۔ کہ میں نے دربار دہلی سنہ ۱۹۱۱ء کے وقت خوب جلی قلم اشتہارات (شہنشاہ انگلستان کا مسلمان ہو جانا) کے عنوان سے شاہی کیمپ میں تقسیم کرائے۔ اور خود کنگ جارج کو ایک کتاب بھیجی اور لکھدیا کہ اسمیں آپ کے مسلمان ہونے کی پیشین گوئی ہے۔

جس وقت میں یہ کام کر رہا تھا واحدی صاحب مجکو روکتے تھے۔ ڈراتے تھے۔ اور ڈرتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے شائع کنندہ کی حیثیت میں اپنا نام لکھنے سے انکار کر دیا تھا مگر میں بالکل بے خوف تھا۔ یا تو یقین کی قوت تھی اور یا دوسروں سے زیادہ میرا دل مضبوط تھا۔ اور کسی مواخذہ سے ڈرتا نہ تھا۔ کنگ جارج نے کتاب کا شکریہ بھجوایا تو یہ ڈرنے والے احباب حیران رہ گئے۔

چوتھی تصنیف سفر بمبئی کا روزنامچہ تھا۔ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے یہ بھی سنہ ۱۹۱۲ء کے شروع میں شائع ہوا تھا۔ ضخامت ایک سو دو صفحے اسمیں بمبئی گجرات

کاٹھیاواڑ کے حالات ہیں اور ابتک صرف دو مرتبہ چھپا ہے۔ یعنی کچھ زیادہ مقبول نہیں ہوا۔ پہلے قیمت ۸ر تھی اور آجکل ۱۲ر ہے۔

پانچویں کتاب اسلام کا انجام کے نام سے شیخ توفیق بکری شیخ المشائخ مصری کی کتاب مستقبل الاسلام کا ترجمہ تھا۔ اسمیں مسلمانوں کی تعداد اور اسلام کے انجام کی فلسفیانہ بحث ہے۔ یہ ترجمہ اب تک ۳ مرتبہ چھپ چکا ہے۔ اور پہلا ایڈیشن ۱۹۱۲ء میں چھپا تھا۔ ضخامت ۴۴ صفحہ پہلے قیمت ۲ر تھی آجکل ۶ر ہے۔

چھٹی کتاب اسرار کے نام سے حضرت بہاؤ اللہ آفندی بانی فرقہ بابیہ کی کتاب کا اردو ترجمہ تھا۔ اصل کتاب مصر میں حضرت عبد البہا عباس آفندی خلف حضرت بہاء اللہ نے مجکو دی تھی۔ اس کتاب میں تصوف کا نہایت فصیح و بلیغ عبارت میں بیان ہے۔ یہ کتاب بھی چار مرتبہ چھپی ہے اور پہلا ایڈیشن ۱۹۱۳ء میں چھپا تھا۔ ۴۸ صفحہ ضخامت قیمت

ساتویں کتاب مجموعہ مضامین حسن نظامی ۱۹۱۲ء میں یہ مجموعہ پہلی بار چھپا اسمیں اسوقت تک کے اخباروں اور رسالوں سے میرے لکھے ہوئے مضامین جمع کئے گئے تھے۔ اور میر ینرنگ صاحب بی۔ اے وکیل انبالہ نے اسپر دیباچہ لکھا تھا۔ ایکسو باون صفحہ کی ضخامت تھی۔ یہ مجموعہ دوبارہ نہ چھپا اور بھیا احسان نے ۱۹۱۳ء کے آخر میں سی پارۂ دل کے نام سے ایک بڑا مجموعہ اس کے عوض مرتب کیا۔ ایکروپیہ قیمت تھی۔

آٹھویں کتاب سفرنامہ مصر و شام و حجاز دو سو بارہ صفحہ کی ضخامت تھی۔ باتصویر و بے تصویر چھپا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں دفتر اخبار توحید نے شائع کیا تھا اور اب ۱۹۱۹ء میں اسکا دوسرا ایڈیشن چھپا ہے قیمت ۱۲ر باتصویر ۱۰ر بلاتصویر

نویں کتاب اعمال حزب البحر یہ بھی ۱۹۱۳ء کے آخر میں دفتر توحید نے چھاپی تھی۔ ایک ۱۰۰ صفحہ کی ضخامت کی کتاب ہے۔ اور آج تک چار ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ بہت مقبول چیز ہے۔ مشائخ نے اسکو بہت پسند کیا ہے۔ قیمت ۸ر

دسویں کتاب سی پارۂ دل۔ پہلا احسان کی دلچسپ ترتیب ابواب کے ساتھ میرے تمام مضامین کا مجموعہ ہے۔ بڑے سائز کے باریک قلم دو سو تیس صفحہ ہیں۔ واحدی صاحب اور مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سکرٹری انجمن ترقی اردو نے دیباچہ لکھے ہیں۔ قیمت ؏

گیارھویں کتاب غدر دہلی کے افسانے۔ پہلا احسان کی احتیاط نے سابقہ مجموعہ مضامین کے بہت سے مضامین سی پارۂ دل میں درج نہ کئے تھے۔ انہی میں غدر دہلی کے قصے بھی نکال دیئے گئے تھے۔ جن کو میں نے ایک رسالہ میں علیحدہ چھاپ دیا۔ چھوٹا سائز اور ایک سو اٹھائیس صفحہ کی ضخامت تھی۔ کئی بار چھپی۔ پہلا ایڈیشن شاید ۱۹۱۳ء کے شروع میں چھپا تھا۔ جنگ یورپ کے شروع ہونے کے بعد اندیشہ ہوا تھا کہ ضبط ہو جائے گی۔ مگر مسٹر ہیلی چیف کمشنر دہلی نے تحریری اجازت اسکے چھاپنے کی دی۔ اور اضافہ مزید کے بعد بڑے سائز پر اسکو چھاپا گیا۔ اور اب چوتھا ایڈیشن اسکا چھپ رہا ہے ایک سو ساٹھ صفحہ کی ضخامت قیمت پہلے ۸ر تھی اب ۱۲ر

ایضاً حصہ دوم غدر دہلی کے افسانے سنہ ۱۹۱۷ء میں پہلی بار اور سنہ ۱۹۱۹ء میں دوبارہ چھپا اسمیں انگریزوں کے حالات ہیں۔ ضخامت ۷۲ صفحے قیمت ۸ر

بارھویں کتاب فیضان سنوسی۔ یہ شیخ سنوسی کا تیسرا حصہ ہے اسمیں بھی پیشین گوئیاں ہیں ۹۶ صفحہ ضخامت ہے چار دفعہ چھپا اور اب چھاپنے کی ممانعت ہے۔ قیمت ۸ر

تیرھویں کتاب تین پر ایک۔ یہ چوتھا حصہ شیخ سنوسی کا ہے اسمیں بھی پیشین گوئیاں ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۴ء میں چھپا تھا۔ پھر دوسرا شائع ہوا اسکے بعد ممانعت ہو گئی۔ اور اب فیضان سنوسی و کتاب الامر کی طرح نایاب ہے چالیس صفحہ کا تھا قیمت

چودھویں کتاب ۔ ناگفتہ بہ۔ یہ پانچواں حصہ شیخ سنوسی کا تھا اور پیشین گوئیاں تھیں

اسکے چھاپنے کی بھی ممانعت ہے۔ پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ چالیس صفحہ کا تھا۔ قیمت ۲؍

پندرھویں کتاب جرمنی خلافت۔ چھٹا حصہ شیخ سنوسی کا تھا۔ جس گورنمنٹ کے مضمون پر چھپ کرایا اور ۳۴ صفحہ ضخامت تھی جو فوراً پولیس ضبط کر کے لے گئی۔ ایک کتاب بھی بکنے نہ پائی۔ قیمت ۵؍

سولھویں کتاب اُردو دعائیں۔ ستر صفحہ کی کتاب ہے اور اسمیں ہر قسم کی ضرورت اُردو دعائیں ہیں ۲ بار چھپ چکی ہے قیمت ۲؍ پہلا ایڈیشن سنہ ۱۳۳۲ ہجری میں چھپا تھا۔

سترھویں کتاب کم کی موت۔ ایک سو ساٹھ صفحہ کی کتاب ہے اور موت یاد دلانے کے مضامین ہیں سنہ ۱۹۱۶ء میں چھپی تھی۔ قیمت ۸؍

اٹھارھویں کتاب قبروں کے غیبی نوشتے۔ اسمیں الواح قبور ہیں اور بہت دلچسپ و جدید طرز کی کتاب ہے۔ خیالی و اصلاحی نوحے ناصح لوگوں کی لکھی گئی ہیں سنہ ۱۹۱۶ء میں چھپی تھی۔ ضخامت ۷۰ صفحہ قیمت ۸؍

انیسویں کتاب محرم نامہ۔ واقعات کربلا اور اسلام کے دور اول کی تاریخ ہے بہت ہی مقبول کتاب ہے پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا تین بار چھپ چکا ہے ۱۹۶ صفحہ کی کتاب ہے قیمت ۱۰؍

بیسویں کتاب میلاد نامہ۔ میلاد شریف اور اسلام کی تاریخی کتاب ہے پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا۔ چار بار چھپ چکا ہے ۱۷۶ صفحہ کی ضخامت قیمت ۱۲؍

اکیسویں کتاب بیوی کی تعلیم۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں پہلا ایڈیشن چھپا تھا زنانہ تعلیم کے لیے بہت پسند کی گئی۔ چار بار چھپ چکی ہے ۲۴۴ صفحہ ضخامت ہے قیمت ۱۲؍

بائیسویں کتاب یزید نامہ۔ محرم نامہ کا دوسرا حصہ۔ کربلا کے بعد کی تاریخ ہے۔ بنی امیہ کے خاتمہ تک۔ پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۷ء میں چھپا تھا۔ دوسرا

اب چھپا ہے ۱۵۵ صفحہ کی ضخامت ہے۔ قیمت ۱۲؍

۲۳ تیئیسویں کتاب اتالیق خطوط نویسی۔ دو حصوں میں پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں دوبارہ چھپی۔ اسمیں میرے خطوط اور نامور مسلمانوں کے خطوط ہیں ایکسو بیس صفحہ کی ضخامت قیمت ۱۰؍

۲۴ چوبیسویں کتاب مجموعہ خطوط حسن نظامی۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں چھپا تھا۔ ایکسو بیس صفحہ کی ضخامت ہے۔ قیمت ۱۲؍

۲۵ پچیسویں کتاب محفل نامہ گیارہویں شریف۔ حضرت غوث پاک کے حالات میں ہے۔ پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۸ء میں چھپا تھا۔ ۸۰ صفحہ کی کتاب قیمت ۴؍

۲۶ چھبیسویں کتاب کرشن بیتی۔ سری کرشن کے حالات میں بہت مقبول و نامور تصنیف ہے ۱۴۴ صفحہ کی ضخامت ہے۔ پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۷ء میں چھپا تھا۔ اب دوسرا چھپا ہے۔ باتصویر ہے۔ قیمت ۱۲؍

۲۷ ستائیسویں کتاب رہنمائے سیر دہلی۔ دہلی کی گائڈ اردو زبان میں ہے۔ ۸۰ صفحہ کی کتاب اور باتصویر ہے۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں پہلا ایڈیشن چھپا تھا۔ قیمت ۸؍

۲۸ اٹھائیسویں کتاب انتخاب توحید۔ اخبار توحید کے مضامین کا مجموعہ ہے پہلا اڈیشن سنہ ۱۹۱۳ء میں چھپا تھا۔ ختم ہوگیا ۱۰۲ صفحہ کی ضخامت تھی اسمیں زیادہ تر سب میرے مضامین تھے۔ قیمت ۸؍

۲۹ انتیسویں کتاب چٹکیاں گدگدیاں۔ اسمیں میرے ظرافت کے مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۸ء میں چھپا۔ قیمت ۱۰؍ ضخامت ۱۱۵ صفحہ

۳۰ تیسویں کتاب جگ بیتی۔ اسمیں میری لکھی ہوئی کہانیاں ہیں۔ ۸۰ صفحہ کی ضخامت ہے۔ پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۷ء میں چھپا تھا۔ قیمت ۴؍

۳۱ اکتیسویں کتاب رسول کی عیدی۔ بچوں کے لئے مفید و دلچسپ مضامین ہیں

پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۲ء میں چھپا تھا پانچ بار چھپ چکی ہے۔ چھوٹے سایز کے ۴۴ صفحہ ہیں قیمت ۲ر

بتیسویں ۳۲ کتاب فلسفۂ شہادت۔ شہادت کربلا کا فلسفیانہ ٹریکٹ ہے ۲ بار چھپا ہے چھوٹے سایز کے ۳۲ صفحہ کی ضخامت ہے قیمت ار

تینتیسویں ۳۳ کتاب توپ خانہ۔ جنگ یورپ شروع ہونے کے وقت چھوٹا سا ٹریکٹ لکھا گیا تھا کئی بار چھپا۔ صفحہ ۳۲ ہیں قیمت ار

چونتیسویں ۳۴ کتاب بندوق۔ ۱۶ صفحہ۔ پینتیسویں ۳۵ کتاب بم ۴ صفحہ چھتیسویں ۳۶ کتاب چھرکا اعلان جنگ ۳۲ صفحہ سینتیسویں ۳۷ کلجگ کا میدان جنگ ۳۲ صفحہ اڑتیسویں ۳۸ کتاب ہوائی جہاز۔ انتالیسویں ۳۹ جرمن شہزادہ کی لاش ۱۶ صفحہ یہ سب چھوٹے چھوٹے ٹریکٹ ہیں اور کئی بار چھپے ہیں ان میں تصوفانہ طریقہ سے بحث کی گئی ہے۔

چالیسویں ۴۰ کتاب فرام قبلہ ٹو شملہ۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں ایک خط لارڈ ہارڈنگ کو لکھا گیا تھا ۱۶ صفحہ کی ضخامت ہے ۲ بار چھپا ہے قیمت ار

اکتالیسویں ۴۱ کتاب خدائی انکم ٹیکس۔ زکوٰۃ کا ٹریکٹ۔ ۴۴ صفحہ ضخامت ہے سنہ ۱۹۱۴ء میں پہلی بار چھپا تھا۔ ختم ہو گیا پھر نہ چھپا۔ قیمت ار

بیالیسویں ۴۲ مرشد۔ ۴۸ صفحہ ۲ر **تینتالیسویں ۴۳** نئی یادداشت۔ ر **چوالیسویں ۴۴** ہمارے رسول کی عادتیں۔ **پینتالیسویں ۴۵** آل انڈیا خاک ڈپوٹیشن۔ غرض علاوہ متعدد چھوٹے چھوٹے ٹریکٹ بار بار چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔

ان کتابوں پر رائے چھوٹی بڑی چھیالیس ۴۶ کتابیں ہیں۔ جو چھپ کر شائع ہوئیں انہیں سے بعض اس قدر مختصر ہیں کہ ان کو کتاب کہنا سخت ظلم ہے۔ مثلاً میگزین یعنی توپ خانہ وغیرہ رسائل کو کتاب کہنا کسی طرح جائز نہیں۔ محض شمار معلومات کے لئے ان کے نام درج کئے گئے ہیں۔

نمبر ۴۲ کے تحت میں مرشد جس کتاب کا نام لکھا گیا وہ ماہوار رسالہ مرشد سنہ ۱۹۱۲ء

چیز ہے۔ اسمیں طبی مضمون ہے اور اب اسکا پہلا ایڈیشن باقی نہیں رہا۔ اور دوسرا چھاپنے کا موقع نہیں ملا۔ **دینی یادداشت** میں بچوں کی دینی معلومات کا بہت اچھا ذخیرہ تھا ہزاروں کی تعداد میں کئی بار چھپا اب موجود نہیں ہے۔ **ہمارے رسول کی عادتیں** بھی بہت مفید ٹریکٹ تھا کئی بار چھپا۔ اب کم فرصتی کے سبب نہیں چھپتا۔ آل انڈیا خاک ڈپوٹیشن ایک دلچسپ خط ہے جو مسٹر مانٹیگو وزیر ہند کو بھیجا گیا تھا جبکہ وہ اصلاحات کی تحقیق کے لیے ہندوستان آئے تھے۔ اور طرح طرح کے اعلی و فرضی ڈپوٹیشن انکی خدمت میں پیش ہو رہے تھے تو میں نے آل انڈیا خاک ڈپوٹیشن کے نام سے ان کو ایک خط لکھا تھا۔ اسکے اندر جو کچھ تھا وہ نام سے ظاہر ہے۔

مذکورہ بالا رسائل و کتب میں پبلک کو جو کتابیں سب سے زیادہ پسند ہیں اسکا اندازہ بکری سے کرنا چاہیے۔ میں کارکن صاحب حلقۃ المشائخ سے جو میری کتابوں کے ناشر و پبلشر ہیں ہر مہینے کے خاتمہ پر ایک نقشہ منگا کر دیکھتا ہوں تاکہ معلوم کروں کہ بکری میں کونسی کتاب سب سے زیادہ ہے تو پانچ کتابیں سب سے بڑھی چڑھی رہتی ہیں ایک میلاد نامہ۔ دوسرے بیوی کی تعلیم۔ تیسرے غدر دہلی کے افسانے۔ چوتھے محرم نامہ۔ پانچویں حزب البحر۔

ان پانچوں میں بھی تین کتابوں کا مقابلہ رہتا ہے۔ کسی مہینہ میں میلاد نامہ بڑھ جاتا ہے۔ اور کسی میں بیوی کی تعلیم۔ اور کسی میں غدر دہلی کے افسانے (حصہ دوم اسکا کم بکتا ہے) بعض متبرک مہینوں میں حزب البحر کی بکری سب سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ کیونکہ ان ایام میں اسکی زکوۃ دینے والے زیادہ خریدتے ہیں۔ ایام محرم قریب ہوتے ہیں تو محرم نامہ اور یزید نامہ کی فروخت سب کتابوں پر فائق ہوتی ہے۔

پبلک میں صاحب رائے جماعت میری کل تصنیفات میں غدر دہلی کے افسانوں کو سب سے زیادہ کامیاب تصور کرتی ہے۔ اللہ سکو ماسٹر بہیس (چوٹی کی چیز) کا خطاب دیا جاتا ہے فلسفی اور بہت اعلی طبقہ والے کم ڈومرت کو پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت اکبر آبادی

اور مولوی عبدالماجد صاحب بی۔ اے مصنف فلسفہ جذبات وغیرہ کا یہی خیال ہے۔

لیکن میں خود میلاد نامہ۔ محرم نامہ۔ یزید نامہ اور یزید کی تعلیم کو اپنی کامیاب تصانیف خیال کرتا ہوں۔

میں نے کسی کتاب میں اتنی محنت نہیں کی جتنی تلاش و عرق ریزی کرشن بیتی لکھنے میں ہوئی۔ مگر وہ مذکورہ پانچ کتابوں کی طرح فروخت نہیں ہوتی۔ البتہ تعریف ہندو مسلمان دونوں کرتے ہیں۔ اور بعض قومی۔ ملکی خیال کے لوگ اسکو سب سے بڑھ کر درجہ میری تصنیفات میں دیتے ہیں (آجکل میسور ریاست نے کورس میں شامل کیا ہے)

سی پارۂ دل اور چٹکیاں گدگدیاں بھی پسند کی جاتی ہیں۔ اور بہت بکتی ہیں مگر انکی قبولیت محض انشا پرداز یا ادب پسند طبقہ میں زیادہ ہے۔

رہنما سیر دہلی ایسی کتاب ہے جسمیں سب کتابوں سے زیادہ لاگت لگائی گئی اور بہت ہی اعلیٰ اہتمام سے اسکو چھپوایا۔ مگر سب کتابوں سے زیادہ ناکام ہوئی۔ بہت ہی کم بکتی ہے۔ اسکی وجہ بعض لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ اسمیں سلطنت کے افسروں کی تعریف ہے مگر میرا خیال ہے کہ یہ وجہ اسکی ناکامی کی نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ کتاب ایک محدود شہر کے حالات سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی کتاب کی بدولت گورنمنٹ نے میری نگرانی دور کی۔ اور میری شدید مشکلات کا خاتمہ ہوا جو تصنیف و تالیف میں حارج تھیں۔

بہت احباب اور واحدی صاحب کہتے ہیں کہ اب میری تحریر میں وہ مخصوص جدت اور مزہ نہیں پایا جاتا جو ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۳ء تک تھا۔ میں نہیں جانتا یہ کہنا درست ہے یا نہیں۔ البتہ یہ خیال مجکو بھی ہوتا ہے کہ کم فرصتی اور زیادہ کام کرنے کی وجہ سے تحریر میں وہ خوبی پیدا نہیں کر سکتا جو فرصت کے زمانہ میں ہو جاتی تھی۔ اور کچھ یہ بھی ہے کہ وہ وقت جوش اور نمو کا تھا۔ تندرستی اچھی تھی۔ اب زوال اور کمزوری کا زمانہ ہے۔ تاہم آجکل مطالعہ کتب کی زیادتی کے سبب معلومات کا پہلو غالب رہتا ہے جو شروع زمانہ کی کتابوں میں جدت

کم بلکہ بالکل نہیں ہے۔

الفاظ کی تکرار

داعدی صاحب کی ایک چوٹ ہے کہ عبارت میں ایک وضع کے الفاظ بار بار آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اب آپکی تحریر میں مکرر الفاظ بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں ان کا یہ کہنا غلط نہیں ہے۔ لیکن۔ مگر۔ اور۔ وغیرہ الفاظ نادانستہ بار بار میری قلم سے نکلتے ہیں۔ جن کا روکنا میرے اختیار کی بات نہیں ہے۔ اگر میں انکا خیال کروں تو آدھا کام بھی نہ کر سکوں۔ میرا خیال ہے کہ شروع زمانہ میں صاف و بے عیب عبارتیں بہت سی لکھدیں۔ اب زمانہ عبارت آرائی کا نہیں ہے بلکہ مفید اور ضروری مضامین اردو زبان میں جمع کرنے کا وقت ہے اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ میں قلم برداشتہ لکھتا چلا جاؤں قواعد و چستی عبارت کی پرواہ نہ کروں۔

اگر کوئی شخص تنقید کی نظر سے میری کتابوں کو دیکھیگا تو اسکو ایک حیرت خیز بات محسوس ہوگی کہ میں نے بہت محدود الفاظ سے یہ سب کام کئے ہیں۔ یعنی میری زبان پر گنتی کے چند الفاظ چڑھے ہوئے ہیں۔ انہی سے میں نے کام لیا۔ اور ہر قسم کے مضامین ادا کر دئے۔ الفاظ کی وسعت میرے ہاں نہیں ہے۔ اور حافظہ درست نہ ہونے کے سبب مجھکو مقررہ و معلومہ الفاظ کی سوا ادائے مطلب کے وقت اور کوئی لفظ یاد نہیں آتا اور میں اپنے ہی محدود الفاظ سے ہر مطلب کو ادا کر دیتا ہوں۔ پھر اگر میری عبارت میں الفاظ کی تکرار ہو تو تعجب نہ کرنا چاہیئے۔

ایک اور وجہ

تکرار الفاظ اور غیر موثر عبارت کی یہ ہے کہ اب میں زیادہ تر کام کی باتیں لکھتا ہوں خیالی مضمون آفرینی نہیں کرتا۔ اور میری حالت ابتدا سے یہ ہے کہ علمی مضمون یا کسی مادی واقعہ نویسی کے وقت عبارت کا زور قائم نہیں رکھ سکتا۔ خیالی جذبہ کے مضامین میں خود بخود اور بے ساختہ چستی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

ایک برس سے کوئی کتاب نہیں لکھی ۱۹۱۸ء کے آخر سے کوئی تصنیف شائع نہیں ہوئی۔ حالانکہ پہلے ہر مہینہ ایک کتاب تیار ہو جاتی تھی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ میں نے ایک ماہوار رسالہ مرشد کے نام سے جاری کیا تھا۔ چھ مہینے اسمیں اس قدر مصروفیت رہی کہ دوسرا کام نہ کر سکا۔ مجبوراً اسکو بند کیا اور سابقہ مشغلہ کیطرف متوجہ ہوا۔ اسوقت کئی کتابیں زیر تالیف و تصنیف ہیں۔ ان میں **حلالخور** تیار ہے۔ **طمانچہ بر رخسار یزید** تیار ہے **حضرت علی** اور ان کا فلسفہ تیار ہے **بیوی کی تربیت** حصہ دوم بیوی کی تعلیم تیار ہے۔ **مجموعہ خطوط** حصہ دوم تیار ہے **اتالیق خطوط نویسی** حصہ سوم تیار ہے۔ **فاطمی دعوت اسلام** لکھ رہا ہوں۔ **تذکرہ دوزادہ امام** کی یادداشت مکمل کر لی ہے **آپ بیتی** کا یہ حصہ تیار کر لیا ہے باقیات مہدی کا ترجمہ و حاشیہ تیار کر رہا ہوں۔ **مسلمان دل کے اور گھر کے اندر** زیر تحریر ہے۔ اور سب سے بڑی چیز **اے اللہ پیر بھائی** وہ کتاب ہے جسکے دوسرے حصہ کی پہلی فصل کے طور پر یہ رسالہ آپ بیتی حسن نظامی پیش کیا جاتا ہے۔ اے اللہ کی کتاب بہت وسیع مضامین کی چیز ہو گی۔ اور ایک مدت دراز اسکی تصنیف و تکمیل کے لیے درکار ہے۔ اسواسطے میں اسکی فصلوں کو الگ الگ شائع کرتا ہوں تاکہ اشاعت میں آسانی ہو۔ اوپر جس قدر تیار کتابوں کے نام لکھے گئے۔ انمیں سے اکثر لکھی جا چکی ہیں۔ یعنی کاپی نویس لکھ رہا ہے۔ عنقریب چھپنی شروع ہو نگی۔ البتہ طمانچہ بر رخسار یزید کی اشاعت میں کچھ غور طلب امور ہیں۔ اور مصلحت کا خیال کرنا ہے۔

مجموعہ خطوط حصاول کی بکری چونکہ کم ہے اسواسطے کارکن صاحب دوسرے حصہ میں روپیہ خرچ کرنا پسند نہیں کرتے۔ **حلالخور۔ بیوی کی تربیت** وغیرہ بہت جلد شائع ہو جائینگے۔

تصنیف کی مشکلات۔ عام مصنفوں سے میری حالت میں بہت فرق ہے۔

غالباً کسی مصنف کو ایسے پراگندہ کام نہ کرنے پڑتے ہونگے جو مجھکو گھیرے رہتے ہیں۔ چالیس پچاس خطوط روزانہ کے پڑھنے جواب لکھنے لکھوانے میں بہت وقت درکار ہوتا ہے۔ خط لکھنے والے بارہ بارہ اور سولہ سولہ صفحہ کے خط بھیجتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ میں ان کو جواب لکھنے کے لیئے بیکار بیٹھا رہتا ہوں۔ مجھکو تو ان طویل خطوط کے پڑھنے کی بھی فرصت نہیں ہوتی۔ تاہم اپنا فرض سمجھکر سب کو پڑھتا ہوں اور جواب لکھتا یا لکھواتا ہوں۔ مگر جواب کے اختصار کو دیکھکر لوگ ناراض ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ بھی امیر حمزہ کی داستان کی طرح خرافات سے لبریز ہو۔

میں نے ہر مرید کو پابند کیا ہے کہ اپنے حالات سے مجھکو آگاہ کرتا رہے۔ اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں بھی ہر مرید کو اپنے حال سے مطلع کیا کروں۔ مجھکو آگاہ رہنے کی ضرورت ہے کہ میں مریدوں کے نیک و بد حالات کا خدا کے سامنے جوابدہ ہوں ان کو جو دینی و دنیاوی واقعہ پیش آئے تو وہ مجھکو لکھیں۔ تاکہ میں ان کے لیئے دعا کروں یا مناسب معلوم ہو تو مشورہ دوں۔ اور اگر جواب دینے کی کوئی بات نہو تو خاموش ہو جاؤں لیکن مرید یہ سمجھتے ہیں کہ ہفتہ واری رپورٹ مجکو بھیجیں۔ اور پھر ہفتہ واری رپورٹ کے ہر حصہ کا ان کو جواب دیا جائے۔ یہ کیا مشکل کام ہے۔ ساٹھ ہزار مریدوں میں اگر دس ہزار بھی جواب کی توقع کریں تو مجکو ایک بڑا عملہ جواب دینے کے لیئے رکھنا پڑے اور میں خود بھی سارا دن اسی کام میں لگا رہوں۔ میں جواب نہیں دیتا اسواسطے کہ جواب کی کوئی بات نہیں ہوتی تو وہ رنجیدہ ہوتے ہیں اور میری خفگی کا قیاس کرکے معافیاں مانگتے ہیں۔ اور اس سے میرا کام بڑھتا ہے۔ اور تصنیف کے لیئے وقت نہیں بچتا۔

میں لکھ دینا چاہتا ہوں کہ مریدین مجکو اپنے حالات سے مطلع رکھیں مگر جواب لینے کا خیال ترک کر دیں۔ اور طویل خط کوئی نہ لکھا کرے۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ صبح سے شام تک تعویذ مانگنے والے گھیرے رہتے ہیں۔ ہر روز

ہیں نے وقت مقرر کر دیا ہے پھر بھی جہلا نہیں مانتے اور وقت ضائع کرتے ہیں۔ مجبوراً زنانہ
مکان میں ہر وقت بند رہتا ہوں۔ مگر تعویذ طلب عورتوں سے چھٹکارہ وہاں بھی نہیں ملتا۔
وہ اندر گھس آتی ہیں۔

شہرت یافتہ آدمی کی دید کا شوق ایک دوسرا وبال ہے۔ سینکڑوں آدمی خواہ مخواہ
بیٹھتے ہیں۔ پوچھیے مجھ سے کوئی کام ہے تو کہتے ہیں۔ جی کچھ نہیں محض آپکے دیکھنے کا
اشتیاق تھا۔ بہت اچھا اشتیاق پورا ہو گیا۔ اب آپ تشریف لے جایئے مگر وہ طرح
جم کر بیٹھ جاتے ہیں گویا وہ میرا قیمتی وقت آمارتے ہیں یا میں نے اپنا گھر ان کے پاس گروی
رکھ دیا ہے یا مجکو ان کا کچھ قرضہ دینا آتا ہے۔ کسی طرح ان کا اشتیاق پورا نہیں ہوتا۔
کچھ کہتا ہوں تو کج خلقی ہے۔ چپ رہتا ہوں تو وقت ہاتھ سے جاتا ہے۔

تیسرا اخلجان سفارش چاہنے والوں کا ہے کوئی دن خالی نہیں جاتا۔ ایکنہ ایک
صاحب تشریف لے آتے ہیں کہ فلاں مرید کو سفارشی خط لکھدو۔ نوکری مل جائے۔ قرضہ
بحال ہو جائے۔ بیٹی کی شادی کے لئے مدد ملے۔ اسوقت دو مشکلیں ہوتی ہیں۔ ایک سفارش
لکھنے کی جسکو میں پسند نہیں کرتا۔ دوسرے وقت ضائع ہوتی۔

تیسرے اخباروں اور رسالوں کے مضمون مانگنے والے ناک میں دم کرتے ہیں۔
ہندوستان میں دستور ہو گیا ہے جسکو کوئی کام نہ آتا ہو وہ اخبار یا رسالہ جاری کر دیتا ہے
پھر ہیکڑی یہ ہوتی ہے کہ مضمون نگار اسکے رسالہ کو پر کریں۔ طرح طرح کی خوشامدیں
کرکے طرح طرح کی دہمکیاں دے کر طرح طرح کے توڑ جوڑ سے مضمون مانگے جاتے ہیں
اوسط لگائی جائے تو ہر روز ایک نئی فرمایش مضمون کی آتی ہے۔

خدا اس سے زیادہ طاقت دے خان بہادر مولوی میرزا سلطان احمد صاحب کو
جو مضمون لکھنے کی مشین ہیں کہ ملازمت کا مشکل کام بھی انجام دیتے ہیں۔ اور تمام ہندوستان
کے رسالوں میں مضمون بھی لکھتے ہیں ان کا یہ کمال قابل تقلید ہے کہ طلب مضمون کا خط پہنچے کہ

تیسرے دن ایک ٹھاٹھ کی اور بہت عالمانہ مضمون آجاتا ہے۔ میں نے ہر رسالہ والے سے سنا ہے کہ جب ہم نے ان سے کچھ مانگا ہمیشہ انہوں نے دیا۔ اور وہی دیا جو مانگا۔

مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔ اور بہت کم فرمائشوں کی تعمیل کرسکتا ہوں تاہم اور لکھنے والوں کی نسبت بہت لکھتا ہوں۔ اور اکثر رسائل میں میرے مضامین جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ تصنیف و تالیف کا حرج ہوتا ہے۔

میں کتنا کام کرتا ہوں

اگر کوئی مجھکو کام کرتا دیکھے تو میرے ناتواں جسم اور روز روز کی بیماری کا خیال کر کے حیران رہ جائے کہ میں کیونکر اتنی محنت کرسکتا ہوں۔ اور کس طرح میرے اوسان چاروں طرف کی بے تکی اور جاہلانہ ہلچل میں سلامت رہتے ہیں اور میں سب کے ساتھ اخلاق و نرمی کا برتاؤ کرسکتا ہوں۔ چار بجے صبح سے لے کر دس گیارہ بجے رات تک مجھکو ایک سکنڈ کی ایسی فرصت نہیں ملتی جسکو میں فرصت کہہ سکوں۔ البتہ سفر کے زمانہ میں ایک حد تک اطمینان رہتا ہے۔

واحدی صاحب اور بھیا احسان تعجب کرتے ہیں کہ میں پراگندہ بات چیت اور لوگوں کے ذاتی جھگڑوں میں مصروف رہ کر کیونکر مضامین اور کتابیں لکھ لیتا ہوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسی وجہ سے مضامین اور کتابیں پہلے کی طرح دلچسپ اور اچھی عبارت میں نہیں ہوتیں

میرا دل اس سے خوش ہوتا ہے کہ خدا نے اپنی مخلوق کے جو کام میرے سپرد کیے ہیں ان کو ادا کرنے کی صلاحیت اس نے دی۔ اسواسطے میں زیادہ گھبراتا نہیں اور سب کو برداشت کرتا ہوں۔ مجھے بیوی بچوں اور دنیا کی خوشیوں سے لطف اٹھانے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ میرے بچے شفقت پدری کا مزا نہیں جانتے اور ڈھائی سالہ لڑکا حسین جب میرے سامنے آتا ہے تو کچھ دیر کھڑا ہو کر اور یہ دیکھ کر کہ میں نے اسکی طرف توجہ نہیں کی تام تام کہتا ہوا بھاگ جاتا ہے۔ اور اماں سے جاکر کہتا ہے۔ ابا۔ تام یعنی ابا کام کر رہے ہیں۔ اور مجھ سے بات نہیں کرتے۔

قصہ مختصر میری حالت دوسرے مصنفوں سے بالکل جداگانہ قسم کی ہے۔ اور میں جو کچھ لکھ لیتا ہوں میرے خیال کی موافق یہ بھی بسا غنیمت ہے۔

میری اچھی بری خصلتیں

انسان کو اپنے عیب بہت کم نظر آتے ہیں۔ مگر میری عادت ہے کہ میں اکثر اوقات اپنے عیبوں کو سوچا کرتا ہوں۔ اور اچھی خصلتوں کو بھی یاد کرتا ہوں۔ تاکہ اچھی بری خصلتوں میں تمیز کرسکوں۔

خود پسندی

سب شاعروں۔ انشا پردازوں۔ علمی کام کرنے والوں میں خود پسندی کا مادہ ہوا کرتا ہے اور وہ اپنے سامنے کسی کی لیاقت و قابلیت کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ مجھ میں یہ عیب زیادہ تو نہیں ہے مگر تھوڑا بہت اسکا اثر اپنے اندر پاتا ہوں۔ سارا جہان کچھ ہی کہے اپنے مریدوں یا دوستوں کی زبان سے کسی دوسرے لکھنے والے۔ یا کسی صاحب کمال یا درویش کی تعریف مجھکو ناگوار ہوتی ہے۔ اور مجھکو وہ قریبی دوست بہت برے معلوم ہونے لگتے ہیں جو میرے کسی خاص کمال سے دوسرے کے کمال کو بڑھاکر بیان کریں۔ واحدی صاحب سے میں بارہا ناراض ہوا ہوں جبکہا ہوں نے ایسا کیا۔ میں نے ہزاروں مرتبہ ان کو رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث سُنائی ہے جسمیں یہ ارشاد ہوا ہے کہ تیرا دوست وہ ہے جو تیری بات کو دوسرونکی باتوں سے اچھا سمجھتا ہو۔ اور جو تیری مرضی کو دوسرونکی رضامندی سے مقدم جانتا ہو۔ اور جو تیری صحبت کو دوسرونکی صحبت سے کافی سمجھتا ہو۔

جب کبھی ان باتوں کے خلاف ان کا عمل میں دیکھتا تھا ان سے خفا ہو جاتا اور مہینوں بات نہ کرتا۔

میں پسند نہیں کرتا کہ جو لفظ میرے اعزاز کا اخبار ور سالے میں لکھا جائے اسمیں کوئی اور بھی شریک ہو۔ واحدی صاحب مجھکو حضرت لکھتے ہیں اور جب کبھی کسی اور کو وہ حضرت لکھدیں تو مجھکو ناگوار ہوتا ہے۔ مگر وہ اکثر بھول جاتے ہیں اور میری ناراضی کے

شکار ہوتے ہیں۔

یہی حال مریدوں کے ساتھ ہے کہ جس طرح میں انکو اپنا سمجھتا ہوں میری خواہش ہوتی ہے کہ وہ بھی میرے سوا کسی سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں۔

پیر مرید کے تعلق میں تو میرا یہ جذبہ بزرگوں کی تلقین کے موافق ہے۔ کیونکہ انہوں نے حکم دیا ہے کہ اپنے پیر کے سوا (خواہ وہ کیسا ہی ہو) کسی دوسرے پیر سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھو۔

لیکن پیری مریدی کے باہر اس خود پسندی کی عادت کو میں عیب سمجھتا ہوں۔ اور یہ میرے کیرکٹر کا نقص ہے کہ کیوں دوسروں کے واجبی کمال کا اعتراف برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ مخفی قسم کا رشک و حسد ہے۔ خدا اس سے مجھے پاک کردے۔ مگر سچ یہ ہے کہ ابتک تو یہ خرابی میرے اندر موجود ہے۔

خوشامد پسندی اب مجھکو اتنا تجربہ ہو گیا ہے کہ خوشامد اور واقعی تعریف کو فوراً سمجھ لیتا ہوں۔ مگر پھر بھی کیرکٹر کی کمزوری سے خوشامد میرا دل خوش کرلیتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سامنے والا جھوٹی خوشامد کررہا ہے۔ مگر میرے دل میں خوشامدی پر مہربانی پیدا ہوتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ بشریت کا اثر ہے۔ اور اس سے بچنا میرے امکان میں نہیں ہے۔ تاہم روز روز کے غور کرنے سے اب یہ عادت مجھ سے کم ہو رہی ہے۔ اور میں زیادہ غیر واجبی خوشامد کی کچھ پروا نہیں کرتا۔

مروت کی افراط مجھ میں مروت سے دب جانے اور خلاف ضمیر کام کرلینے کی بہت بری عادت ہے۔ مثلاً ایک شخص آن کر عاجزی سے کہتا ہے کہ فلاں بات کی سفارش لکھدو اس سے میرا فائدہ ہوگا۔ دوسرے کا فائدہ دیکھ کر اور اس کی مروت سے مغلوب ہوکر میں بلا تصدیق سفارش لکھدیتا ہوں ایک اعتبار سے یہ اچھی بات ہے

کہ مشتبہ سفارش کرنے سے ایک غرض مند اور ضرورت مند کی امداد ہوتی ہے۔ اور دوسرے اعتبار سے عیب ہے کہ میری قوت خودداری اس مطالبہ کا انکار نہیں کر سکتی۔ اور مروت سے دب جاتی ہے۔

میں چاہتا ہوں اسکی اصلاح نہ کر سکوں کہ اب یہ عادت جم چکی ہے لیکن دوسروں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اپنے بچوں کو اس کمزوری سے بچائیں۔

رائے کی بے استقلالی

میں رائے و ارادہ کا کچھ بہت مضبوط نہیں ہوں جب تک مذہبی رنگ کسی کام میں نہ ہو مجھے ڈر رہتا ہے کہ میری رائے بدل نہ جائے۔ اور ذرا سی مؤثر اور مدلل تقریر و تحریر سے میرا خیال پلٹ جاتا ہے جس سے میں خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہوں۔ اور دوسروں پر بھی اس کا اثر پڑتا ہوگا اسکی وجہ میرے خیال میں یہ ہے۔ کہ قدرت نے میرے دل و دماغ کو فوری تاثر کا مادہ بہت دیا ہے۔ اسوجہ سے معمولی اور رکیک باتوں پر میں عمدہ عمدہ مضامین لکھ لیتا ہوں کہ دماغ کا تاثر سب سے نرالا ہے پھر جب میرے سامنے مؤثر انداز سے کسی خیال و رائے کی تردید کیجاتی ہے تو دماغ کا تاثر اسکو فوراً قبول کر لیتا ہے اور میری رائے بدل جاتی ہے۔ میں اسکو اپنا سب سے بڑا نقص سمجھتا ہوں اور اسکو دور کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ اور اب میرا خیال ہے کہ پہلی زیادتی میں کمی ہو گئی ہے۔

ضد اور ہٹ

راج ہٹ۔ بالک ہٹ۔ تریا ہٹ مشہور ہے۔ میں نہ راجہ ہوں نہ بچہ ہوں۔ نہ عورت ہوں مگر میرے اندر ضد اور ہٹ کا مادہ پایا جاتا ہے۔ اور اسکو بعض حالات میں برا سمجھتا ہوں۔

باوجود رائے کی بے استقلالی کے ضد کا یہ عالم ہے کہ جب ایک بات ٹھان لوں اور اسپر اڑ جاؤں تو خواہ وہ کیسی ہی نامناسب ہو اس سے دست بردار نہیں ہوتا اور اسپر اڑا رہتا ہوں۔

ایکدفعہ داعدی صاحب سے ناراض ہوا اور دل میں ٹھان لیا کہ ایک برس تک ان سے

گھر میں نہ جاؤنگا۔ پھر سب ہی کچھ ہوا مگر سال بھر تک میں نے ان کے گھر میں قدم نہ رکھا وہ خود میرے پاس آتے رہے۔ اور کسی تیسرے آدمی کو یہ محسوس نہیں ہوا کیونکہ میری بات چیت میل جول میں فرق نہ تھا صرف گھر کے اندر نہ جاتا تھا۔

جب میں کسی سے ناراض ہوتا ہوں تو خط میں اسکا نام نہیں لکھتا۔ اسکا تجربہ بھی سوائے واحدی صاحب کے کسی کو نہیں ہوا۔ اور جب ان کے پاس بے نام کا خط جاتا ہے تو وہ میری خفگی کو سمجھ جاتے ہیں۔ ابھی حال میں پریمی احمد آبادی کو بھی اسکا تجربہ کرنا پڑا۔ جنکو تین ہفتہ میں نے بے نام کے خط لکھے۔ اور جبدن یہ مدت ختم ہوئی تو وہ بہت ہی خوش ہوئے۔

میرا خیال ہے یہ ضد اور ہٹ بچوں کی سی حرکت ہے۔ اور کوئی خوبی نہیں ہے اور میں اسکو عیب سمجھتا ہوں۔ تاہم چونکہ مجھ میں ہے اسواسطے لکھدیا۔

سنگدلی

خود مجھکو کوئی حادثہ پیش آئے یا قریبی دوست و مرید کو تو میں اسکے اصلی صدمہ کو بہت کم محسوس کرتا ہوں۔ اور غم سے مجھے رونا نہیں آتا۔ صرف محبت کے قصہ یا واقعہ سے آنکھوں میں آنسو آتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ لکھا تھا غم کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ میرے دل کی سچی تصویر تھی۔ میری بیوی مر گئیں۔ دو لڑکے مر گئے۔ لڑکی مر گئی مگر میرے دل پر اس کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔

گو میں اپنے احباب کے صدمات میں سچے دل سے شریک ہوتا ہوں۔ انکی ہمدردی بجا لاتا ہوں۔ مگر میرے دل پر غم کا وہ اثر نہیں ہوتا جس سے دوسرے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ ایک اعتبار سے یہ بات اچھی ہے کہ میرا دل ایک ہی رخ ہے۔ اور وہ خدا ہے۔ باقی مخلوق کے تعلقات کی طرف مجھکو رغبت نہیں ہے۔

لیکن دنیا عالم اسباب ہے یہاں غم والم سے متاثر ہونا شان آدمیت ہے اور جس میں یہ بات نہو تو میں کہونگا کہ یہ اسکا نقص ہے۔ اور سنگدلی کا عیب اسپر

صادق آئے گا۔

قناعت کھانے میں پینے میں۔ رہنے سہنے۔ چلنے پھرنے میں مجھکو قناعت مدد دیتی ہے۔ اگر بہت مکلف کھانا ملے تب بھی خوشی سے کھا لیتا ہوں اور بہت معمولی ملے تب بھی بلا کسی حس تکلیف کے خوش ہو کر کھاتا ہوں۔ اس مضمون کے لکھتے وقت ۲۷ رمضان ۱۳۴۶ھ کو مہمان زیادہ آگئے اور کھانا کچھ نہ بچا تو میں نے روزہ دار پکانے والوں کو دوبارہ پکانے کی تکلیف نہ دی اور سوکھی روٹی کے ٹکڑے پانی میں بھگو کر کھا لیئے۔ اور آرام سے پڑ کر سو گیا۔ حالانکہ ایک رات پہلے ۲۶ رمضان یوم پنجشنبہ کو خواجہ بانو نے بہت مکلف کھانے کھلائے تھے۔

ایک دفعہ خان بہادر حضرت مولانا سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی کے ہاں مہمان تھا۔ جب ان کے گھر میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ کوئی حادثہ ہو گیا ہے اور کھانا تیار ہونا دشوار معلوم ہوا۔ حضرت اکبر کچھ متردد تھے کہ کیا بندوبست کروں۔ میں نے کہا بازار سے دو پیسہ کی روٹی اور ایک پیسہ کے کباب منگا دیجئے بس کافی ہے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اور میں نے خوشی خوشی اس سے بھوک کا پیٹ بھر دیا۔

لباس میں بھی میرا دل غنی رہتا ہے۔ جیسا بھی مل جائے پہن لیتا ہوں اور کسی وقت مجھے اچھے کپڑے کی تمنا نہیں ہوتی۔ بیوی بچوں کو اس عید ۱۳۴۶ھ کے لیئے نئی جوتیاں نئے جوڑے۔ دو سو روپے سے زیادہ کے میں نے بنوا کر دیئے ہیں۔ مگر اپنے لیئے ایک پائی کا بھی کچھ نہیں بنوایا۔ وہی پرانی جوتی ہے۔ وہی پرانے کپڑے ہیں اور وہی میرا سرور دل ہے۔ اسمیں بخیلی و کنجوسی کچھ نہیں ہے۔ بلکہ دل کی ایک حالت ہے کہ وہ اپنی زیبایش و آسایش کا کبھی خیال نہیں کرتا۔ اور یہی قناعت ہے جسکو میں خدا کے شکر کے ساتھ ایک اچھی خصلت سمجھتا ہوں۔ سواری موٹر ہو۔ لینڈو ہو۔ تانگہ ہو۔ یکہ ہو۔ بیل گاڑی ہو۔ ٹھیلہ ہو سب مجھکو برابر ہیں۔ پیدل بھی بے تکلف پانچ چھ کوس

چلا جاتا ہوں۔ اور عموماً درگاہ سے دہلی تک پیدل جانا ہوتا ہے +

ہمدردی میں کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ خدا جو کچھ مجھے دیتا ہے اس کا بڑا حصہ مستحق غربا کو بانٹ دیتا ہوں۔ میرا ذاتی خرچ اور بیوی بچوں کا خرچ ایک سو روپے ماہوار کے اندر رہتا ہے۔ اور تمام خرچ کی اوسط تین چار سو روپے ماہوار کی ہے۔ جو سب مستحق غریبوں کی نذر ہوتا ہے۔

میں دروازہ پر بھیک مانگنے والوں کو آدھا ٹکڑا روٹی کا نہیں دیتا کیونکہ میرے خیال میں یہ لوگ خیرات کے مستحق نہیں ہوتے۔ بلکہ محتاج عورتوں۔ یتیم بچوں۔ بیوہ اور کمانے کے ناقابل مستورات کو دیتا ہوں یا تعلیم حاصل کرنے والوں کی اعانت میں صرف کرتا ہوں۔

میرا عقیدہ ہے کہ محنت کرنے والے کو اجرت سے کچھ زیادہ بطور انعام کے دینا خیرات میں شامل ہے۔ کیونکہ محنت کرنے والے کو اس انعام سے محنت کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ اور دنیا سے کاہلی و بیکاری کا اثر دور ہوتا ہے۔ میں غریب لوگوں کو تجارت کرنے کے لیئے یا پیشہ کرنے کے لیئے امداد دیتا ہوں۔ مگر انہی کو جنکی نسبت مجھے یقین ہوتا ہے کہ واقعی یہ تجارت کرینگے یا پیشہ و محنت کو اس امداد سے سہارا ملیگا۔ میرے عقیدہ میں خدا انہی کاموں کی برکت سے مجھکو ضرورت سے زیادہ دیتا ہے۔ میں کوئی چیز جمع نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ زکوٰۃ و سرکاری ٹیکس سے میں محفوظ ہوں۔ میری بیوی کے پاس سوائے دو بندوں کے کچھ زیور نہیں ہے۔ البتہ میری لڑکی کے پاس زیور ہے۔ جو اس کی مرحومہ والدہ کا ورثہ ہے۔

مہمان کے آنے سے مجھے خوشی ہوتی ہے اور اکثر اوقات میں بھوکا سو تا ہوں اور سب کچھ مہمانوں کو کھلا دیتا ہوں +

یہ خودستائی کے لیے نہیں بلکہ پیر بھائیوں کی تلقین کے لیے لکھا جاتا ہے تاکہ وہ بھی

طرح عمل کیا کریں۔ اور اسی واسطے یہ حال لکھا گیا ہے۔

غریبوں سے محبت مجھے غریبوں اور کمینوں سے اتنی محبت ہے کہ سوشلزم اور بالشویک جماعتوں کا نام سننے سے پہلے میں نے بہت کچھ ان کے لیے لکھا ہے۔ اور عمل کر کے دکھایا ہے۔ میں چماروں حلال خوروں اور سب گندے اور کمین لوگوں میں اس طرح جاتا ہوں گویا ان کے خاندان کا ایک آدمی ہوں۔ میں ان کے بچوں کو گود میں لیے پھرتا ہوں۔ میں انکی بیماریوں میں ایسی تیمارداری و خدمت کرتا ہوں گویا خود چمار و حلالخور ہوں۔ میں راتوں کو ان کے چھپروں میں بیٹھ کر ان کے بیماروں کے پاؤں دباتا۔ اور دوائیں پلاتا اور کھانا کھلاتا ہوں۔ مجھے ان کا بڑا بننا مقصود نہیں ہے۔ نہ ان کا بڑا بننے سے مجھے کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو میری خصلت کا تقاضا ہے اور میں اس سے بہت ہی خوش ہوں۔ اور اس پر خدا کا شکرانہ بھیجتا ہوں کہ اس نے مجھے ایسا دل دیا۔ (یہ خودستائی کے لیے نہیں لکھا بلکہ دوسروں کی تقلید کے واسطے)

میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب کے پڑھنے والے بھی ایسا کریں۔ ان چند خصلتوں کے اظہار سے میرے کیریکٹر کا سمجھنا آسان ہو گا۔ اب میں اور کچھ لکھتا ہوں۔ جن کا تعلق میری زندگی سے ہے۔

میرے مصلح پیر۔ استاد۔ اور والدین سب سے بڑے مصلح سمجھے جاتے ہیں مگر مجھکو ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی مصلح نظر آتے ہیں۔ جن کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔ والدین کی اصلاح سے میں نے بہت کم فائدہ اٹھایا۔ کہ وہ دونوں مجھکو خردسال چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ استادوں میں مولانا محمد یحیی صاحب مرحوم خلف مولانا محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم کا ممنون ہوں جنہوں نے مجھکو تعلیم کے ساتھ ہی تربیت بھی کیا۔ جنکی تربیت کے اثر سے اپنی ذات پر بھروسہ کرنے کا اثر مجھ میں پیدا ہوا۔ دوسرے مصلح خاکسار صاحب ہیں جن کا ذکر پیشتر آ چکا ہے۔ اور جو سب سے

بڑے نگراں اور مصلح میری زندگی کے ہیں۔

تیسرے مصلح حضرت اکبر الہ آبادی ہیں۔ انکی خدمت میں میری حاضری اتنی زیادہ ہوئی ہے کہ شاید ان کا کوئی دوسرا نیاز مند اس کثرت سے ان کے پاس نہ گیا ہوگا انکی صحبت نے۔ انکی گفتگو نے۔ انکی نصیحت نے انکی خط و کتابت نے۔ انکے کلام نے اور ان کے باطنی اثر نے جو ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے اور جسکو میں ہر وقت اپنے ساتھ سمجھتا ہوں۔ میری زندگی کو ذرہ سے آفتاب بنا دیا۔

اب میں انکی زبان سے بولتا ہوں۔ ان کے دماغ سے سمجھتا ہوں۔ اور سمجھاتا ہوں ان کے دل سے میری خواہش پیدا ہوتی ہے۔ انکی آنکھ سے دیکھتا ہوں۔ اور انکے احساس سے ہر شے کو محسوس کرتا ہوں۔ میری امید ان میں ہے۔ انکی توجہ مجھ میں ہے آج ان کا جسم الہ آباد کی عشرت منزل میں ہے۔ اور کل وہ وجود میری قبر کے سرہانے مدفون ہوگا۔ اگر قدرت کے نوشتہ نے اجازت دی تو میں قیامت تک درگاہ حضرت محبوب الہی کے گوشہ میں درویش خانہ حلقۃ المشائخ کے شمال میں حضرت اکبر الہ آبادی کے باطنی قبر بناکر آرام کروں گا۔ تاکہ میری ابدی زندگی اس ازل کے حرف سے وابستہ رہے

معنوی اور روحانی قوتیں میرے عقیدہ کی موافق انسانوں کی زندگی مرتب کرتی اور انکی رہنمائی ہیں۔ میری زندگی کی تربیت اور خیالات و اعمال کی رہنمائی و اصلاح کا ایک بڑا حصہ حضرت اکبر الہ آبادی کی روحانی و معنوی قوتوں سے ہوا ہے۔ اور خدا نے میری طبیعت میں ایک غیبی اور ازلی مناسبت ان کے خیالات و جذبات و احساسات سے دی ہے کہ جو ان کے دل میں پیدا ہوتا ہے بغیر ان کے اظہار و اعلان کے میرے دل میں بھی خود بخود میری لہر ظاہر ہوتی ہے۔ اور میں اسی کی رہنمائی میں تقریر و تحریر کا عمل کرتا ہوں۔

میں انکی ہر باطنی نعمت کا وارث ہوں۔ اور وہ میری اکثر ظاہری و باطنی حالتوں کے موسم میں

چوتھے مصلح نواب غلام نصیر الدین خان صاحب رئیس شیخ پورہ ضلع میرٹھ ہیں۔ یہ
بوجہ مریدانہ تعلق کے دہلی میں مقیم ہیں۔ اور میں سالہا سال زندگی کے دور
اول میں ان کے ساتھ رات دن رہا ہوں میں یہاں ان کے احسانات کا ذکر نہیں کرتا
جو انہوں نے مجھ پر کئے اور جن سے میرا بال بال بندھا ہوا ہے۔ بلکہ انکی صحبت نے جو
اصلاح میری کی اسکو لکھنا میرا مقصود ہے۔

نواب صاحب سلسلۂ نظامیہ کے متوسل اور درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے خاندانی
حلقہ بگوش ہیں اور انہیں ادب و عقیدت کا وہ مکمل نمونہ موجود ہے جو پچھلے زمانے کے مریدوں
میں ہوتا تھا وہ قدیمی اور شرفا کی مکمل تصویر ہیں انکے تہذیب دار طرز و باتیں طعام خوری [illegible] سے میں نے شائستہ
اور صحیح طرح کھانا پینا بیٹھنا اٹھنا چلنا پھرنا اور [illegible] انکی [illegible] نے مجھکو ادبیت سکھائی۔

پانچویں مصلح ہندوستان کے بے شمار بے وقوف اور عقل سے بے بہرہ آدمی تھے
جب میرے مضامین اخبارات میں چھپنے شروع ہوئے۔ اور ایک
نامور درگاہ کی نسبت لوگوں کو معلوم ہوئی تو احمقوں کا ایک دل ٹوٹ پڑا۔ ایسے عجیب
و غریب عقائد میری متعلق ظاہر ہونے شروع ہوئے کہ اگر خاکسار صاحب کی روک تھام
ہوتی اور بزرگوں کا باطنی تصرف حامی کار و پشت پناہ نہ ہوتا تو میرے گمراہ ہو جانے اور
خدا۔ رسول۔ امام۔ مسیح۔ مہدی۔ بن جانے یا اسی قسم کے دعوے کر بیٹھنے میں کوئی کسر
باقی نہ رہتی۔ میں خود دعویٰ نہ کرتا تھا۔ لوگ خط لکھ لکھ کر اور ملاقاتیں کر کر کے مجھکو اپنی
جہالت سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتے تھے یعنی ایسی حرکات اور ایسے عقائد ان
کے میں دیکھتا اور سنتا تھا کہ نفس مجھکو فریب دیتا تھا کہ یہ سب احمق ہیں اور احمقوں سے
فائدہ اٹھانا ایک عقلمند پر فرض ہے (جیسا کہ بعض نامور بنے ہوئے فریبی مقتداؤں
کی مخفی صحبتوں میں سنا گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جب تک دنیا میں احمق موجود ہیں ہم عقلمند
آسانی سے روٹی کھاتے رہیں گے) مگر خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ ان بے عقلوں نے خوش

عقیدگیوں کے دھوکے سے بچایا اور میں ویسا ہی ناچیز بندہ بنا رہا جیسا کہ تھا اور جیسا کہ
ہوں۔ اور جیسا کہ رہونگا۔ بلکہ ان بیوقوفوں کو بار بار آزمانے سے میرے خیالات کی اصلاح
ہوئی۔ اور میں نے دنیا میں رہنے اور دنیا والوں سے دنیا برتنے کی عقل سیکھی۔ اسواسطے میں
ان کو اپنا مصلح سمجھتا ہوں۔ اور دلی شکریہ کے ساتھ ان احمقان عقل آفرین کا یہاں ذکر
لکھا جاتا ہے۔

چھٹے مصلح

یتیمی۔ بے کسی۔ مفلسی۔ اور مصیبت۔ اگر میں بچپن میں یتیم و بیسیر نہو جاتا
اگر ابتدائی عمر میں مجھ پر بے کسی۔ مفلسی اور مصیبت کا بوجھ نہ پڑتا تو
کبھی میری اتنی اصلاح نہوتی جتنی ہوئی۔

دل کا ٹوٹ جانا۔ سہاروں کا ہاتھ سے چھوٹ جانا انسان کے لئے ایک نعمت ہے
اور اس سے اسکے اندر خود اعتمادی اور سلف ہیلپ (اپنی مدد آپ کرنا) اور خودشناسی
پیدا ہو جاتی ہے۔

میں تو کوئی بڑا آدمی نہیں ہوں نہ میں نے کوئی بڑا کام اب تک کیا ہے لیکن ایک
کامیاب آدمی ضرور ہوں۔ اور مشکلات زندگی پر میں نے بفضل خدا پوری فتح پائی ہے اس
واسطے لکھتا ہوں کہ میری کامیابی کے اسرار میں شکستہ خاطری بھی ایک راز تھا۔

دنیا میں ہر کامیاب اور بڑا آدمی عموماً یتیم ہوا ہے۔ آنحضرت صلعم یتیم تھے حضرت
علی یتیم تھے۔ حضرت غوث الاعظم یتیم تھے۔ حضرت خواجہ اجمیری یتیم تھے۔ حضرت خواجہ
قطب الدین بختیار کاکی یتیم تھے۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر یتیم تھے۔ حضرت محبوب الٰہی
یتیم تھے۔ ملک کے فاتح بھی عموماً یتیم اور بے کس گذرے۔ اس آخر زمانہ کا مشہور فاتح نپولین بوناپارٹ بھی یتیم و مفلس تھا۔

اگر انسان اپنی مصیبتوں کے ایام میں یہ خیال رکھے کہ یہ آفات و پریشانیاں اسکی زندگی کی
ٹانک ہیں اور وہ مردانہ وار ہمت و سعی و عمل سے ان کا مقابلہ کرنا چاہیئے تو اسکو ہمت
ملتی ہوگی اور وہ مصیبتوں سے ان کا مقابلہ کرکے فتح مندی

حاصل کرے گا۔

ساتواں مصلح میرا جذبہ اطاعت اور شوق عمل تھا۔ مجکو جو مفید مشورہ دیا گیا میں نے اسپر غور کیا۔ اور اطاعت کے ساتھ اسپر عمل کرنے کی کوشش کی اگر میں خودسر اور خودرائے ہوتا تو کبھی زندگی کی بلاؤں سے نکلکر زندگی کی نعمتوں میں نہ آسکتا۔ یہ خدا کا فضل تھا کہ اس نے مجھہ میں اطاعت و قبولیت کا مادہ دیا تھا۔

آخری مصلح میرا خدا تھا۔ کہ اول بھی اس نے اصلاح کی آخر بھی وہی مصلح ثابت ہوا۔ اسی کے فضل نے مجکو اقبال دیا کہ میں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا۔ کامیابی ہوئی۔ اور جس رخ میں نے قدم بڑھایا راستے کھل گئے اور میں آسانی سے منزل طے کر سکا۔

اول دن سے خدا کی ذات پر میرا اعتماد تھا۔ اور آج کے دم تک میں اسکے فضل و کرم پر توکل رکھتا ہوں اور اپنی کامیابی کو اسکا فضل سمجھتا ہوں

مریدوں پر راے سب سے پہلے ریاست الور میں بابو فخر الدین نظامی مرحوم انجنیر نے مجھ سے بیعت کی۔ اور دیگر بہت سے لوگ بھی مرید ہوئے۔ مولوی عمر دراز نظامی درگاہی شاہ ساکن سہارنپور جو پہلے مولوی جمال الدین صاحب دہلوی مرحوم کے مرید تھے اور اب مجھ سے حسن عقیدت رکھتے تھے الور جانے کے باعث ہوئے اور انہی کی ترغیب سے اہل الور نے مجھ سے بیعت کی تھی۔ مولوی عمر دراز بعد میں طلب ہوئے اور ان کو میں نے خلافت دی۔ اس زمانہ میں وہ ٹھیکہ داری کرتے تھے۔

اسکے بعد ریاست ریواں میں درگاہی شاہ ٹھیکہ داری کرنے گئے اور انکی ترغیب سے میں وہاں گیا۔ اور بے شمار آدمیوں نے بیعت کی۔ [illegible] ہوا۔ اور وہاں ایک بہت بڑی تعداد مریدوں کی ہوگئی۔ یہ سب غریب لوگ تھے۔ اور زیادہ تر مزدوری کا پیشہ کرتے تھے۔ مگر انکی محبت و اطاعت کی وہ شان تھی جو [illegible]

دیوان کے سلسلہ میں الہ آباد کے محلہ کیٹ گنج میں جس قدر ممتاری پیشہ لوگ رہتے
تھے وہ بھی مرید ہو گئے۔ اور انمیں بھی غایت درجہ کی محبت دیکھی گئی۔ اسی زمانہ میں حضرت
اکبر الہ آبادی سے ملاقات ہوئی اور ان کے قرابت داروں میں بھی مریدی کا سلسلہ قائم ہوا۔
یہ وہ زمانہ تھا کہ روزانہ خطوط کے ذریعہ سے اطراف ہند کے لوگ بیعت کی درخواست
بھیجتے تھے مگر میں نے ان کے یا کسی مرید کے نام لکھنے کی کوشش نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہزارہا
مریدوں کے مجکو پتے معلوم نہیں ہیں اور جب وہ مجکو لکھتے یا مجھ سے ملنے آتے ہیں تب
معلوم ہوتا ہے کہ وہ خط کے ذریعہ سے مرید ہوئے تھے

اسکے بعد مولوی رضی الحق صاحب رضوانی شاہ احمد آبادی نے بیعت کی۔ اور انکو
خلافت دیگی۔ احمد آباد میں اسکے بعد تیزی سے سلسلہ بیعت بڑھنے لگا۔

احمد آباد کے بعد میں حیدر آباد مسٹر حیدری ہوم سکرٹری کی دعوت پر گیا اور وہاں
ڈاکٹر محمد قمر الدین ہلالی شاہ اور بے شمار لوگوں نے بیعت کی۔ اور سکندر آباد میں بھی سلسلہ کو
رواج ہوا۔ اسکے بعد میں بار بار وہاں جاتا رہا۔ اور سلسلہ کو ترقی ہوتی رہی دوسرے
سفر دکن کے موقع پر مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر کا مہمان ہوا اور انہوں نے بھی سلسلہ
چشتیہ نظامیہ میں مجھ سے بیعت کر لی۔ اور تیسرے سفر میں ان کے سب بچے بھی مرید ہو گئے۔
اسکے بعد بنوں کے مہر بخش صاحب دہلی آکر مرید ہوئے اور ان کے ذریعہ
اہل بنوں میں مکتوبی درخواستوں سے سلسلہ پھیلتا رہا۔ اس کے بعد منشی عبدالرزاق نظامی
جنڈارہ سے دہلی آکر مرید ہوئے۔ اور انکی ترغیب سے متعدد لوگ ممالک متوسط سے دہلی
آکر داخل سلسلہ ہوئے۔ پھر سہارنپور میں سلسلہ کی اشاعت ہوئی۔

اسکے بعد محمد اشرف نظامی گلشنی شاہ کے ذریعہ سے صوبہ برہما میں سلسلہ کو بہت
زیادہ فروغ ہوا۔ اور مدینہ منورہ جاتے وقت عدن میں بھی لوگ مرید ہوئے۔ غرض اسی طرح
پنجاب۔ برہما۔ بنگال۔ دکن۔ گجرات۔ کاٹھیاواڑ۔ یوپی۔ سی پی۔ وغیرہ میں نہایت سرعت سے تیزی

سلسلہ کو ترقی ہونے لگی۔

تمام مقامات ہند میں حسب ذیل یہ خلفاء ہیں:۔

صوبہ بہار میں کشفی شاہ۔ یو۔پی میں مولوی عمر دراز درگاہی شاہ۔ گجرات میں مولوی حاجی نبی میاں قربی شاہ۔ دکن میں مولوی محمد نذیر سجادہ نشین کلی شاہ۔ اور القائی شاہ نامی کوہ سوار۔ اور مولوی عبد الشکور مرحوم اور سورت میں حکیم امیر الدین لقائی شاہ۔ اور سندھ میں مولوی شفیع محمد ہٹو حقیقت شاہ اور کشمیر میں پیر حسام الدین گیلانی شاہ اور مراد آباد میں مولوی عبد الرحمن صاحب حیا سنبھل میں حکیم محبوب السبحان نظامی مجیبی شاہ۔

خلفا کی خصوصیات مذکورہ خلفا تکمیل سلوک کر چکے ہیں۔ اس درجہ کو نہیں پہنچے بلکہ ان علاقوں کے مریدین کی نگہداشت کے لیے ان کو خلافت دی گئی ہے۔ انہیں سے مولوی درگاہی شاہ نے بڑا کام کیا ہے۔ ہزاروں مریدوں کو پکا نمازی بنا دیا اور دائمی خدمت کی۔ اور کشفی۔ بنارس وغیرہ میں کثیر افراد کو اپنا مرید کر کے سلسلہ بڑھایا۔

درگاہی شاہ میں بے علم طبقہ کی خدمت و نگہداشت اور ان کو ضابطہ میں منسلک رکھنے کا بہت اچھا سلیقہ ہے۔ اور وہ پرانی طرز کے طالب اور اللہ اللہ کرنے والے بوڑھے درویش ہیں۔

کشفی شاہ بہت ہونہار جوان ہیں۔ انہیں خدمت بنی آدم کا بہت جوش ہے اور سلسلہ کی ترغیب کا خاص ملکہ ہے۔ اور مریدوں سے اتحاد و میل جول رکھنے کا شوق رکھتے ہیں۔ انہیں قوت عمل بہت زیادہ ہے اور میں ان کو درگاہی شاہ کی طرح عملی اور کارگزار خلیفہ سمجھتا ہوں۔ مولوی محمد نذیر صاحب حیدرآبادی بھولے بھالے عابد اور سلوک کی منازل میں مصروف اور میرے مرغوب خلیفہ ہیں۔ مگر عملی قوت ان میں بالکل نہیں ہے۔ اور دکن کے مریدین کو ضابطہ باقاعدہ میں نہیں لا سکے۔ مولوی عبد الشکور صاحب منزل رسیدہ اور سلوک کے کامل خلیفہ تھے۔ مگر افسوس ان کا انتقال ہو گیا۔ القائی شاہ خاندانی پیرزادہ اور انشا پرداز

نوجوان ہیں، اور مجھے انکی قابلیت سے خدمات سلسلہ کی بہت توقعات ہیں۔ حکیم امیرالدین
لقانی شاہ غربا اور کم علم طبقہ میں دینی پابندی اور ترغیب سلسلہ کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ مولوی
قربتی شاہ احمد آباد کے مریدوں کے نگران اور ضابطہ کے اندر کام کرتے ہیں۔ خاندانی پیرزادے ہیں
پیر حسام الدین گیلانی خاندانی پیر ہیں۔ اور سلسلہ کو کشمیر میں فروغ دے رہے ہیں۔
شفیع محمد بھٹو حقیقت شاہ سے مجھکو بہت توقعات ہیں۔ کیونکہ سندھ میں اس لیاقت اور عملی
قوت اور سچی محبت کا آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ مولوی حیا صاحب ایک دفتر میں ملازم ہیں،
رہ دوں کی صورت ہے۔ مگر تبلیغ و اشاعت اسلام کا وصف قدرت نے ان کو دیا ہے سینکڑوں
غیر مسلم ان کے ہاتھ پر اسلام لا چکے ہیں۔ اور لا رہے ہیں۔ حکیم محبوب السبحان بہت عابد زاہد اور درویش
صفت شخص ہیں دکن میں۔ ڈاکٹر قمرالدین ہلالی شاہ بہترین آدمی نہایت مریدین کے لیے مفید
نظر آ رہے ہیں۔ مگر میں لکھنا نہیں چاہتا کہ ان کو کیا بنانا ہے۔ عملی قوت۔ محبت کا برتاؤ۔ سلسلہ
کی شیرازہ بندی ان سے زیادہ بہت کم لوگوں میں دیکھی گئی ہے۔

اگر امارت کا حجاب نہ ہوتا تو مہاراجہ سر کشن پرشاد دکن کی خلافت کا حق ادا کر سکتے تھے
کہ وہ سلوک طے کر چکے ہیں۔ اور صاحب باطن شخص ہیں۔

دکن میں مہاراجہ۔ ہلالی۔ سید عبدالرحمن۔ غلام محی الدین۔ منی بیگم سرفراز اور اطلاع خانہ سکندرآباد
کو سب سے زیادہ اپنے قریب پاتا ہوں۔ مگر ان سب سے زیادہ جن دو کی سچی محبت نے مجھ پر اثر
کیا وہ میر تراب علیخان تحصیلدار اور انکی بیوی امیرا بیگم مہرو بانو ہیں۔

جو اخلاص۔ جو اطاعت۔ جو محبت۔ جو زندہ عمل احمد آباد کے مریدوں میں پایا جاتا ہے
وہ کسی علاقہ کے مریدوں میں ایسی مجموعی حالت میں نہیں ہے۔ ان کو میں نے دل دیا ہے۔ اور
انہوں نے میرا دل لیا ہے۔

مگر دیوان کے مریدوں کو احمد آباد کی محبت سے میں بڑھ کر یاد کرنا چاہتا ہوں کہ
احمد آباد والے مجھکو سمجھنے کی لیاقت رکھتے ہیں۔ اور دیوان نے بے سمجھے مجھکو مانا ہے۔

اور اسکا درجہ سابقون الاولون میں ہے۔ ہنود کے مریدوں کی بیتاب محبتوں کی میں جس قدر
ناز برداری کرسکتا ہوں یہ ثبوت ہے اسکا کہ مجھے ان کے خلوص کا پورا اقرار ہے الہ آباد نے
اپنی محبت کے مسلسل اور پائیدار ثبوت دیے ہیں۔ مگر خانگی نزاع کی حالت میں ان کو میں نے
ایسا مطیع نہیں پایا جیسا کہ میرا دل چاہتا تھا۔ اور جیسے کہ اہل احمد آباد کو دیکھتا ہوں پھر
بھی وہ خانہ جنگی کے جوش کو میرے حکم پر قربان کرنے کی مثالیں دکھا چکے ہیں۔ عزیز بہار تو
میرا ہے۔ اور اسکے جگر میں مجکو طالب علمی کے دن گزارنے کا موقع ملا ہے۔ وہی سہارنپور
جسنے مجکو عبدالحق جیسا دشمن کا یکا آدمی دیا۔ اور وہ گاہی شاہ صاحب جیسا کارگزار شخص وہاں
سے نمودار ہوا۔ دارو غہ محمد عمر اور شیخ عبداللہ اور سماۃ بیدن کے خلوص کو میں کبھی فراموش
نہیں کرسکتا۔ شیخ عبداللہ سے تو مجکو وہ توقع ہے جو اس کو پچھلے پیروں کو مریدوں سے
ہوا کرتی ہے۔

سی پی کے دانشمند اور یکسو تعلق رکھنے والے مرید کتنی ہی شکایت کریں میں
کبھی ان کے علاقہ میں نہیں گیا مگر ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ میرے دل نے ان کے دلوں کی
اکثر مرتبہ سیر کی ہے۔

پنجاب میرے واسطے عالم خواب ہے۔ اسمیں جو بیدار ہوا پوری طرح جاگا۔
برہما کی روشنی ابھی پنجاب کے دم سے ہے۔

برہما برہم عقل کی محبت کا منظر ہے۔ گو تجارت و ملازمت کے ابر میں چھپا
رہتا ہے مگر میں اسکو جھانک جھانک کر دیکھ لیتا ہوں اور وہ تو کبھی میری طرف سے
آنکھ نہیں پھیرتا۔

سندھ و کشمیر میرے مستقبل کے دروازے ہیں۔ وہاں جو آثار الفت کے
نظر آتے ہیں وہ بشارتیں ہیں آیندہ رقت روشن کی۔ بنگال و جار مشرقی پہلو میرے
سلسلے کے ہیں۔ اور ان میں لگن کا نور تیک رہا ہے۔

راجپوتانہ جہاں سب سے پہلا قدم میرا نصیب ہوا تھا مجھکو پکارتا ہے۔ لیکن میں لبیک نہیں کہہ سکتا جب تک کہ حکم خداوند نہ ہو۔

کاٹھیاواڑ میں بیگم صاحبہ والیہ ریاست مانا ودر بیگم صاحبہ منگرول اور بڑی بڑی ممتاز لوگ سلسلے کے خدا کار۔ اور گجراتی محبت کا قد آدم آئینہ ہیں۔ مگران سب میں محمد بدر الدین بدر شاہ ولاہوتی خلف نواب صاحب والی ریاست مانگرول کو قلم بندی کے ہنر سے دل بند کرکے دکھانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ وہ کاٹھیاواڑ ہی کا بدر نہیں بلکہ سلسلہ نظامیہ کا ماہتاب بننے والے ہیں۔

زندگی کے تجربے اور مشاہدے

ہر شخص اپنی زندگی میں عجیب و غریب تجربے کرتا ہے۔ اور مشاہدات خاص سے اسکا واسطہ پڑتا ہے۔ مگر یہ تجربے اور مشاہدے اسکی ذاتی خصلتوں اور معلومات۔ اور مذاق و مزاج و احساس کے موافق ہوتے ہیں۔ حکمران لوگ سیاسی تجربوں اور مشاہدات میں مصروف رہتے ہیں۔ اور ان کو ان کی معلومات اور ذاتی دلچسپی پالیٹکس کے سوا زندگی سے اور کچھ سبق حاصل نہیں کرنے دیتی۔ مذہبی لوگ مذہب کے مشاہدات و تجربات زندگی سے اخذ کرتے ہیں۔ یہی حال اور سب لوگوں کا ہے۔ کہ جیسے وہ خود ہوتے ہیں اسی قسم کے تجربے اور مشاہدات سے ان کو سابقہ پڑتا ہے۔ اور ان کے تجربے اور مشاہدے انکی ذاتی حالت میں محدود رہتے ہیں۔

یہ کچھ امور اور بڑے آدمیوں پر موقوف نہیں ہے ہر درجہ اور ہر قسم کے آدمیوں کو اس زندگی میں ایسے حالات پیش آتے ہیں جو پر اسرار افسانے معلوم ہوں اگر ان کو لکھا جائے۔ اور ان حالات سے دوسرے ہدایت پائیں۔ اگر اس نیت سے ان کو بیان کرنے یا سننے کی کوشش ہو۔

خدا نے ہر انسان کو خود اپنا بادشاہ۔ خود اپنا استاد۔ خود اپنا پیر اور خود اپنا طالب اور خود اپنا مطلوب بنایا ہے۔ اگر وہ اپنی بادشاہی کے فرائض کو سمجھنے اور انپر

عمل کر سکے تو اسکو کسی غیر بادشاہ کے محکوم و مطیع ہونے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر وہ اپنی استادی کی قابلیت سے خود اپنی ہستی کو تعلیم دے تو پھر دنیا میں کسی کا شاگرد بننے کی اسکو ضرورت نہیں ہے۔ اگر اسکو آگاہی ہو جائے کہ درحقیقت میں خود اپنا پیر ہوں اور مجھ پر اپنے اعضائے جسم۔ اور اعضائے روح یعنی حواس ظاہر و حواس باطن کی ہدایت و تلقین واجب ہے۔ اور یہ فرض میں خود ہی سب سے اچھی طرح ادا کر سکتا ہوں تو پھر اسکو کسی غیر پیر کا مرید ہونا ضروری نہیں۔ اگر وہ اپنی اس شان کو سمجھ لے جس سے مغلوب ہو کر وہ دوسروں کا طالب بن جاتا ہے تو وہ سراپا طالب ہو کر اپنی ہستی کو اپنا مطلوب بنا لے۔ اور خود طالب اور خود ہی مطلوب بن جائے۔

مگر یہ صفات خدا کی دین سے کسی کسی کو حاصل ہوتی ہیں۔ ہر انسان ایسا نہیں بن سکتا۔ دنیا میں جس قدر نبی اور پیغمبر ہوئے ہیں وہ اسی قسم کے آدمی تھے جنکو خدا نے ان کی ہستی کا عرفان دیدیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ خدا کی طرف سے خود اپنے بادشاہ۔ خود اپنے استاد۔ خود اپنے پیر اور خود اپنے طالب و مطلوب تھے۔

مگر پیغمبروں میں بھی سب برابر نہ تھے۔ کسی کو اپنے عرفان کی دو چار صفات ملی تھیں کسی کو دس بیس۔ کسی کو سو پچاس۔ کسی کو ہزار دو ہزار۔ اور کوئی تمام صفات کا مالک تھا اور کل صفتوں اور قوتوں کا عارف کامل سوائے حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دوسرا کوئی نبی نہ تھا۔

حضرت محمد رسول اللہ صلعم پر نبوت ختم ہو گئی۔ اور وحی کے ذریعہ اپنی شناخت اور اپنے فرائض کا عرفان موقوف ہو گیا۔ لیکن خدا تعالیٰ نے امت رسول اللہ صلعم میں یہ نسبت باقی رکھی کہ وہ نبوت محمدی اور وحی رسالت کے پرتو اور روشنی سے اپنی ہستی و خودی و وجود کا عرفان حاصل کر سکتی ہے۔ اور کرتی ہے۔ بشرطیکہ خدا تعالےٰ اسمیں یہ صلاحیت پیدا کرنی چاہے اور امت محمدیہ کے افراد بھی اپنے حسن عمل سے استعداد مستعد ہوں۔

فلسفۂ حیات پر جو کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ وہ سب نقلیں اور حکایتیں ہیں۔ کوئی انکو سمجھتا ہے اور کوئی نہیں سمجھتا۔ مگر اصل فلسفہ زندگانی کی کتاب خود اپنی زندگی ہے۔ اگر اسکو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ورنہ جس طرح جاہلوں اور ان پڑھ لوگوں کے سامنے فلسفہ زیست کی کتابیں الماری میں رکھی رہتی ہیں۔ اور کوئی ان سے فائدہ حاصل نہیں کرتا اسی طرح انسان کی ذاتی زندگی کی کتاب فلسفہ چپ چاپ پڑی رہتی ہے۔ اور آخر ایک دن کرم خوردہ ہو کر نابود ہو جاتی ہے۔

میرا ذاتی علم بہت تھوڑا تھا۔ میری عقل بھی بہت محدود تھی۔ میرے گرد و پیش آشنا بھی ایسے نہ تھے جو میرے لئے کرایہ کا علم اور کرایہ کی عقل مہیا کرتے جس طرح امیروں کو مدرسوں اور کالجوں کی تعلیم کرایہ کا علم و عقل مہیا کر دیتی ہے۔ مگر خدا تعالے نے میرے اندر اپنے سب سے بڑے رسولؐ اور سب سے زیادہ عارف صفات انسانی اور کامل معارج آدمیت کی روشنی جلوہ گر فرمائی۔ اور مجکو مشاہدۂ ذات اور معائنہ وجود اور اپنی خودی کے مطالعہ کی طاقت دی جسکو میں نے نور نبوت کی روشنی میں حاصل کیا۔ تو کیا چونکہ میں رسولؐ الکل حضرت رسول اللہ کی نسل میں ہوں۔ اسواسطے یہ قوت مجکو عطا ہوئی؟ نہیں کیونکہ لاکھوں آدمی نسل رسولؐ میں موجود ہیں جنکو اس نعمت سے ذرا بھی حصہ نہیں دیا گیا۔ بلکہ یہ نعمت محض فضل پروردگار سے حاصل ہوئی۔ اور اسی نے نبوت کے آفتاب کی ایک کرن میرے مشاہدات کے آلہ جسم پر ڈالی جس سے میں نے اپنی ہستی کو بھی پہنچانا۔ اور دوسروں کی زندگی کے مشاہدات سے بھی فائدہ حاصل کیا۔

ہندوستان میں ہزاروں آدمی مجھ سے کہیں زیادہ علمیت رکھتے ہیں مجھ سے کئی حصہ سے بڑھکر انشا پرداز ہیں۔ مگر انکی ضخیم کتابوں کو کوئی نہیں پوچھتا اور میری لکھی ہوئی چند سطریں ہاتھوں ہاتھ لے لی جاتی ہیں۔ آج ہندوستان کے اخبارات اور رسائل میرے ایک مضمون کا معاوضہ خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو ایک اشرفی بخوشی دیتے ہیں۔ اور

چاروں طرف سے پکارتے ہیں کہ پہلے ہم کو دو۔ پہلے ہم کو دو۔ اور بعض لوگوں کی ایک پوری کتاب بھی ایک اشرفی کو کیا آدھی اشرفی کو بھی کوئی نہیں لیتا۔

آج ہندوستان میں ہزاروں درویش۔ سینکڑوں گدی نشین موجود ہیں۔ اور جو عام خلق کی بے شمار حیثیات ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ اور میں انہیں سے ایک حیثیت بھی اپنے اندر نہیں پاتا۔ نہ انکی طرح میں رات دن اسی ایک کام میں مصروف رہتا ہوں نہ میری بود و باش ایسی ہے جس سے لوگ میرے مرید ہوں مگر سارے ہندوستان میں کوئی علاقہ ایسا نہیں ہے جہاں خود بخود لوگ میرے مرید نہ ہوئے ہوں۔ (میں گدی تکیہ لگا کر نہیں بیٹھتا۔ مریدوں کا حلقہ ساتھ لے کر نہیں چلتا۔ اور کوئی شان ایسی نہیں رکھتا جس سے بڑا پیر معلوم ہوں) ہر پیر کے مریدین ایک علاقہ میں محدود ہوتے ہیں میرے مرید کل ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور کوئی مقام ان سے خالی نہیں ہے۔

ہندوستان میں بے شمار آدمی سیاست و پالٹیکس کے ماہر ہیں۔ اور ملک کی سیاسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مجکو نہ سیاسیات کی سمجھ ہے۔ نہ میں نے آجتک ملک کا کوئی بڑا کام کیا ہے۔ مگر ملک کے ہندو مسلمانوں میں سیاسی طور پر بھی ایک حیثیت میری مانی جاتی ہے۔

یہ سب امور محض فضل خدا سے مجکو نصیب ہوئے ہیں۔ اور اسی فضل کی قوت ظاہر کرنے کو میں نے یہ سب بیان کئے ہیں۔ کیونکہ قرآن شریف میں نعمت رب کے اظہار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (اپنے پروردگار کی نعمتوں کو بیان کرو) لہذا ہر انسان کو چاہیئے کہ جب اسکو اس قسم کی کوئی نعمت حاصل ہو تو اسپر غور کرے۔ اور خدا کے فضل کا اظہار و شکر یہ بجالائے۔

اس تمہید کے بعد اب میں اپنے مشاہدات و تجربات لکھتا ہوں۔ تمہید کی ضرورت کو ہر شخص نے سمجھ لیا ہوگا کہ میں اس سے یہ غرض رکھتا ہوں کہ ان مشاہدات کو بنی ہوئی بات

والقلک کے ماتحت تصور کیا جائے۔ نیز ہر انسان اپنی زندگی اور اپنی ہستی پر غور کرے اور اسکو سمجھنے کی کوشش کرے۔ کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (جسنے اپنی ہستی کو پہچان لیا۔ اُسنے خدا کو پہچان لیا) ۔

پہلا مشاہدہ - خدا کا اقرار

مجھ پر ایسا زمانہ گذرا ہے یا ایسے لوگوں کی صحبت میں گزرا ہوں جسمیں خدا کا انکار تھا۔ مجھکو مذہب ایک اخلاقی بندوبست اور سوسائٹی (جماعت) کا عقلی بندھن معلوم ہوتا تھا مگر مسلمانوں میں خصوصاً مذہبی پیشواؤں کے گھرانہ میں پیدا ہونے کے سبب کھلم کھلا انکار خدا کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اور دل ہی دل میں مذہب کی عظمت اصلی کو انسان کی آزادی و حریت کا دشمن تصور کرتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مذہب کو صرف اصلاح اخلاق کی حد تک آدمی پر غلبہ ہو جائز ہے۔ اسکے بعد مذہب کا جبر و ظلم ہے۔ اگر وہ انسان کو اپنا غلام بنانا چاہے۔ خدا کی نسبت میں سمجھتا تھا اگر وہ ہے چشم ما روشن دل ما شاد۔ اور اگر نہیں ہے تب بھی کچھ حرج نہیں کیونکہ آدمی میں اتنی عقلی قوت موجود ہے کہ وہ خدا کے بغیر بھی اپنا کام چلا سکتا ہے۔

مگر جس دن میں نے حضرت علیؑ کا یہ قول پڑھا کہ عرفت ربی بفسخ العزائم (میں نے خدا کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا) تو میرے دل میں ایک پھانس چبھ گئی اور مجھکو تلاش خدا کا ایک فکر پیدا ہو گیا۔ اور جب کبھی میری عقل و محنت و تدبیر نے ایک ایسا کام تیار کیا۔ جسکی تکمیل میں کوئی ظاہری رکاوٹ نظر نہ آئی۔ اور مجھکو دعویٰ ہو گیا کہ یہ کام ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ لیکن وہ منصوبہ ادھورا رہ گیا۔ اور اس کام کی تکمیل ناگہانی اور سمجھ میں نہ آسکنے والی اسباب سے پر ہوتے ہوتے ناقص رہ گئی تو حضرت علی کے قول کی پھانس کھٹکی اور مجھکو خدا کا خیال آنے لگا کہ اسی کی طاقت نے اس کام کو پورا نہ ہونے دیا۔ حالانکہ کوئی تدبیر باقی نہ رہی تھی۔

رفتہ رفتہ میرے مشاہدہ کو معلوم ہو گیا کہ انسان کے ہر عمل میں خدا پوشیدہ ہے اور اسکی عقل و تدبیر ایک ذریعہ اور بہانہ ہے۔ ورنہ بغیر خدا کے کوئی کام بھی پورا نہیں ہو سکتا۔

شروع شروع میں مجھ پر خدا کے دخل در معقولات کا اپنی پے در پے ناکامیوں اور تکلیفوں سے یہ اثر ہو گیا کہ یا تو بالکل منکر خدا تھا۔ اور یا اپنے آپ کو مجبور محض سمجھنے لگا۔ اور یہ خیال ہو گیا کہ انسان کی تدبیر کوئی شے نہیں ہے۔ جو کچھ ہے خدا ہے مگر رفتہ رفتہ مشاہدات نے اسکو بھی غلط ثابت کیا۔ اور ایک درمیانی حد قائم ہو گئی کہ انسان کا کام تدبیر ہے۔ اور یہ کہ خدا کے فضل پر اس تدبیر کی تکمیل منحصر ہے۔ نہ بغیر عمل تدبیر کے خدا کی تائید ہوتی ہے اور نہ بغیر فضل خدا کے کوئی تدبیر کامیاب ہو سکتی ہے۔

رسول خدا سے محبت

دیکھا دیکھی کی محبت۔ اور سنی سنائی تعریفوں کی وجہ سے میرے دل میں رسول خدا صلعم کی بہت محبت پیدا ہو گئی تھی۔ مگر اصلی محبت اس مشاہدہ نے پیدا کی۔ کہ دنیا میں جس شخص نے عروج کی انتہا اور خاص کی قدرت و قوت حاصل کی تو اسمیں کچھ نہ کچھ گھمنڈ اور غرور پیدا ہو گیا اور وہ ماتحتوں سے اپنے آپکو بلند و اعلیٰ سمجھنے لگا۔ چنانچہ تاریخوں کے مطالعہ میں اس نکتہ کو پیش نظر رکھ کر میں نے ہر فاتح بادشاہ اور ہر نامور حکیم و فلاسفر کے حالات کو اس خرابی سے آلودہ پایا کہ وہ عروج کے بعد بدل گیا اور غروری کی ایک جھلک اسمیں پیدا ہو گئی۔ مگر حضرت محمد رسول اللہ کی ساری زندگی بالکل یکساں پائی۔ جیسے وہ دور عسرت اور ناکامی و پریشانی کے زمانہ میں تھے ویسے ہی فتح مکہ کے بعد جبکہ عرب کا ہر قبیلہ فوج در فوج آکر مسلمان ہوتا تھا اور سوائے اطاعت شعاروں کے ایک مخالف کی بھی صورت نظر نہ آتی تھی آنحضرت کا طرز عمل ویسا ہی زاہدانہ اور مساویانہ رہا۔ جیسا کہ شروع میں تھا۔ اور ان کے عمل میں ایک بات بھی ایسی نہ پائی گئی جس سے کچھ بھی غرور و خود پسندی کی بو آتی۔

اس مشاہدہ نے میری محبت کو دیوانوں کی طرح آنحضرت سے وابستہ کر دیا اور

طے کر لیا کہ اگر خدا مجھکو بھی کامیابی اور اقتدار کی زندگی عطا فرمائے گا تو میں رسول خدا کی اس سنت پر عمل کرونگا اور غرور و تمکنت کو پاس نہ آنے دونگا۔

آج جو کچھ تبدیلی میری مفلسی و پریشانی میں اچھے اور آسایش کے وقت نے پیدا کی ہے اسمیں مجھکو نظر آتا ہے یا میں خود اسوہ حسنہ رسول خدا کا خیال کرنے سے نفس کو دبا کر دیکھتا ہوں کہ کچھ بھی گھمنڈ اور تمکنت اس حالت سے مجھ میں نہیں ہے۔ اور میں اسی غریبانہ مزاج اور مفلسانہ عادت سے زندگی بسر کرتا ہوں جیسے پہلے کرتا تھا۔ بوجھ کندھے پر رکھکر دہلی شہر کے بازاروں میں پھرتا ہوں۔ اور پوزیشن کا ذرا سا خیال بھی میرے دل میں نہیں آتا سواری نہ ملے تو پیدل چلنے میں مجھکو اپنی بے وقعتی کا خوف نہیں ہوتا۔ موٹر میں بیٹھوں تو غرور نہیں کرتا۔ اور دوسرے دن ایک ذلیل ٹوٹے پھوٹے یکہ میں بیٹھنا پڑے تو نہیں سوچتا کہ کل تو موٹر میں بیٹھا تھا۔ آج یکہ میں کیونکر بیٹھوں کیونکہ میں منزل پر پہنچنے کا خیال ضروری سمجھتا ہوں اور اس کو نہیں دیکھنا چاہتا کہ کس ذریعہ سے منزل پر پہنچا۔

اسوۂ حسنہ رسول خدا کے مشاہدہ نے زندگی کی راحت کا یہ مشاہدہ مجھکو دیا کہ جو شخص خوشی میں نہ اترائے اور غم میں نہ گھبرائے اسکی زندگی اس دنیا میں بہشت کی زندگی ہے۔ اور یہ اختیار نفس پر کہ خوشی و غم کا غلام نہ بنے جب ہی ہوتا ہے کہ کسی اپنے سے بڑے شخص کی زندگی کا دل کی آنکھوں سے مشاہدہ کرے۔ اور اپنی زندگی سے مطابق کرکے دیکھتا رہے۔

بزرگوں سے عقیدت

پیروں بزرگوں سے عقیدت کے مسئلہ کو میں نے جس قدر سوچا اسی قدر موجودہ پیروں اور بزرگوں سے بیزار ہوتا گیا۔ کیونکہ جو واقفیت میں نے سیاحت اسلامی دنیا اور سیر ہندوستان میں گدی والے اور نامور بزرگوں کے اندرونی حالات سے حاصل کی تھی وہ بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ میں نے ہر شخص کو دنیادار اور دنیا دغا و فریب میں مبتلا دیکھا تھا۔ اور دل نے فیصلہ کر لیا تھا

کہ تدبیروں اور ظاہری دکھاوے سے اور مریدوں کے مشہور کرنے سے یہ لوگ بڑے بنتے ہیں ورنہ درحقیقت یہ کسی عقیدت کے مستحق نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ تو دنیاداروں سے بڑھ کر دنیا میں آلودہ ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ خیال اتنا بڑھا کہ متقدمین دگذشتہ زمانہ کے بزرگوں کی نسبت بھی شک ہونے لگا کہ ان کو بھی کتابیں لکھنے والوں نے مشہور بنا دیا ہے۔ ورنہ یہ بھی ایسے ہی ہونگے جیسے یہ ان کے پیرو اور مقلد ہیں۔

اسی زمانہ میں حضرت اکبر الہ آبادی کا ایک شعر دیکھا جسکا مضمون یہ تھا کہ تو چراغ کو دیکھ اور اسکی روشنی میں راستہ چل۔ چراغ دکھانے والے کو نہ دیکھ کہ وہ اچھا ہے یا بُرا ہے۔ اگر اسکو دیکھے گا تو راستہ نہ چل سکیگا۔ کیونکہ روشنی آگے پڑتی ہے چراغ کے پاس تاریکی رہتی ہے۔

اس شعر نے میرے مشاہدہ کے رخ کو بدل دیا۔ اور میں نے بزرگوں کی عقیدت کو ذاتیات سے ہٹا کر اس ارشاد پر متوجہ کر لیا۔ جو ان کی زبان سے ادا ہوتا ہے اور جو ان کے ظاہری اعمال سے صادر ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی ارشاد کی بدولت ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی شیرازہ بندی اور اصلاح ہوتی ہے۔ اور وہ ارشاد ہی عقیدت و اطاعت کا مستحق ہے۔

مشاہدہ کا رخ بدلتے ہی مجکو ان برتر بزرگوں کے کمالات و محاسن زیادہ نظر آنے لگے۔ اور ان کے عیب کا اثر دل سے دور ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اب میرا مشاہدہ دلی صداقت سے ان بزرگوں کا ادب کرتا ہے۔ اور انکی دنیاوی کمزوریوں کو لازمۂ بشریت سمجھتا ہے جس سے کوئی آدمی جب تک کہ وہ آدمی ہے پاک ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

غرض مشاہدہ کی اس تبدیلی سے میں نے یہ بات اصولی زندگی کی شان میں رکھی کسی کے عیب و ہنر کو دیکھو تو اپنے عیب و ہنر کی عینک لگا کر۔

اعتدال کا مشاہدہ میں نے اپنی ہر ناکامی اور کامیابی کی وجہ پر غور کرنی شروع کی تو مشاہدہ نے مدت کے بعد بتایا کہ اعتدال میں کامیابی ہے۔ اور بے اعتدالی میں ناکامی جس کام کو میں نے اعتدال سے شروع کیا۔ اور اعتدال سے چلایا۔ اور آخر تک اعتدال کو پیش نظر رکھا اسکو میں نے حاصل کر لیا اور کچھ دشواری اسکے حصول میں نہ ہوئی اور جس کام کو جلد بازی اور بے اعتدالی کے ولولہ میں ڈالا شکست کھائی اور ناکام رہ گیا۔ اعتدال دین کے کاموں میں اور دنیا کے مقاصد میں یکساں ضروری ہے۔ آجکل پولیٹیکل خیالات میں نرم و گرم فرقوں کو معتدل و غیر معتدل کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور میں معتدل (ماڈریٹ) فریق اکو اچھا نہیں سمجھتا کیونکہ میرے ذہن میں اعتدال کی جو تعریف ہے۔ اس سے معتدل گروہ محروم ہے۔ اور غیر معتدل (ایکسٹریمسٹ) جماعت بھی اپنی گرمی میں اعتدال کو ملحوظ نہیں رکھتی لہذا وہ بھی میری رائے میں ناکام رہیگی۔

عمل میں نام کا اعتدال نہیں بلکہ حقیقت کا اعتدال ہونا چاہیئے۔ سیاسی جماعتیں جو معتدل ہونے کا دعوی کرتی ہیں وہ بے اعتدالی سے خوشامد اور چاپلوسی کی طرف جھک جاتی ہیں اور یہ شان اعتدال کے خلاف ہے۔ معتدل وہ ہے جو نہ ادھر جھکتا ہے نہ ادھر بلکہ وسط میں قائم رہتا ہے۔

ہندوستان کی پالیٹکس میں میرے زیر بحث مقصد کی مثال میں سے اصلی اعتدال کی صورت معلوم ہو سکے یہ ہے کہ حق اور مقصود سے جوش اعتدال میں جدا نہ ہو۔ فرق اعتدال و غیر اعتدال کا اس حق و مقصد کی طلب میں ہونا چاہیئے کہ جو فریق گرم ہے وہ گستاخانہ اور احمقانہ جلد بازی کے طریقوں سے حق طلب کرتا ہے۔ معتدل فریق شائستگی اور وقار اور حفظ مراتب کی شان سے حق طلب کرے۔ یہ نہ ہو کہ جوش اعتدال میں حق و مقصد ہی کے خلاف ہو جائے۔ جیسا کہ آجکل ماڈریٹ پارٹی کے لیڈر نادانستگی سے کر بیٹھے ہیں کہ انکی روش ہندوستان کے حق اور مقصد کے صریح خلاف نظر آتی ہے۔ اس سے اعتدال

ہی کا چہرہ مسخ نہیں ہوتا بلکہ گرم پارٹی کے طیش اور مجنونانہ حرکات کو بھی تقویت ہوتی ہے
اور وہ ان گمراہ اعتدال پسندوں کی ضد سے از حد خلاف اعتدال چلنے لگتی ہے۔ اور اس
گناہ کا عذاب اعتدال پسندوں کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے جو باعث اس خطا کے ہوئے

کھانے میں اعتدال۔ پینے میں اعتدال۔ پہننے میں اعتدال۔ رہنے سہنے میں اعتدال
کمانے میں اعتدال۔ خرچ کرنے میں اعتدال۔ دوستی میں اعتدال۔ دشمنی میں اعتدال۔
یہاں تک کہ عبادت خدا میں بھی اعتدال کی ضرورت ہے جو لوگ بے اعتدالی سے ہر وقت
نماز۔ روزے۔ وظائف میں مشغول رہتے ہیں۔ اور فرائض زیست اور حقوق دنیا کو
پس پشت ڈال دیتے ہیں وہ غیر معتدل ہیں۔ اور خدا کی لعنت اس عبادت کے عوض انکے
نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہے۔

جو کھانے میں اعتدال نہ کرے گا۔ تو زیادہ کھانے سے ہیضہ ہو جائے گا یا کم
کھانے سے بدن میں کمزوری پیدا ہوگی۔ جو حد سے زیادہ پانی پئے گا بیمار ہو جائے گا اور کم
پینے سے بھی علالت پیدا ہوگی۔ جو موسم کے خلاف اور غیر معتدل کپڑے پہنے گا اس کو
تن پوشی کام نہ دے گی اور نقصان اٹھائے گا۔ جس کا مکان اور رہنے کی جگہ غیر معتدل
ہوگی وہ کبھی بود و باش کا آرام نہ اٹھا سکے گا۔ کمانے اور محنت کرنے میں جو اعتدال سے آگے
بڑھے گا چار دن میں تھک کر بیٹھ جائے گا۔ اور جو اعتدال سے کمائے گا برسوں سلامت
رہیگا۔ اور خرچ کے اعتدال کی نسبت تو قرآن شریف نے فرما دیا ہے کہ کھاؤ۔ اور پیو
اور فضول خرچی نہ کرو۔ کہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔ فضول خرچی
سے مراد بے اعتدال خرچ کرنا ہے۔ اردو مثل ہے جتنی چادر دیکھو اتنے ہی پاؤں
پھیلاؤ۔ یعنی جس قدر خرچ کرنے کو ہو اسی اعتدال سے خرچ کرو۔ گنجائش سے آگے نہ بڑھو۔

دوستی کا اعتدال اور دشمنی کا اعتدال تو ایسی چیزیں ہیں جنکو میں ایک بڑی کتاب
میں کھول کھول کر لکھوں تب بھی ضرورت پوری نہ ہو کیونکہ دنیا میں بڑی خرابی اسی

بے اعتدالی سب سے بڑی برائی ہے اور لوگوں کو دوستی کے اعتدال اور دشمنی کے اعتدال کا راز سمجھنے میں بہت دشواری پیش آتی ہے۔

آج دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ اسی دولت اعتدال سے محروم ہیں۔ انگلستان کے مدبروں نے جنگ یورپ میں دوستی اور دشمنی کے اعتدال کو ملحوظ نہ رکھ کر بڑے بڑے نقصان اٹھائے ہیں۔ انہوں نے اپنے بہت پرانے دشمن روس کو عارضی دوستی کے ایام میں اتنا زیادہ دوست بنا لیا کہ دولت۔ ہتھیار۔ اور پوشیدہ راز تک اسکو جلدی سے دیدئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دولت اور ہتھیار اور راز روس نے انگلستان ہی کے خلاف استعمال کیے۔ اگر وہ دوستی کا اعتدال ملحوظ رکھتا اور حد سے زیادہ اس نے دوست پر بھروسہ نہ کر لیا تو اسکو وہ شرمندگی جو عقلاً میں اٹھانی پڑی اور یہ مادی نقصانات جو اسکو علانیہ پیش آئے کبھی برداشت نہ کرنے پڑتے۔

یہی حال دشمنی کے اعتدال کا ہے۔ مگر میں اسکی مثال جنگ یورپ اور انگلستان کے کلام سے نہیں دینی چاہتا۔ کیونکہ اسمیں بعض باتیں لکھنے کے قابل نہیں ہیں۔ البتہ اتنا لکھنا چاہتا ہوں کہ جنکو دشمن سمجھا جائے۔ یا جنکی دشمنی سے سابقہ پڑے تو ایسی روش قائم کرنی چاہیئے کہ جب وہ دشمن دوست ہو جائے تو اس سے ندامت نہ اٹھانی پڑے۔

بزرگوں نے کہا ہے۔ دوست سے اپنے سب راز نہ کہو شاید وہ کبھی تمہارا دشمن ہو جائے اور دشمن پر سب جور ختم نہ کرو۔ شاید کبھی اسکو تمہاری دوستی کا موقع ملے تو تمہارے جور تم ہی کو ستائینگے۔

میرا نقص

دوستی کے مسئلہ میں مجھکو اپنا نقص ہزاروں مشاہدوں نے بتایا کہ میں جلدی سے دوسروں کا دوست بن جاتا ہوں۔ یا دوسروں کو اپنا دوست سمجھنے لگتا ہوں۔ دوستی بہت مشکل چیز ہے۔ اور اسمیں بڑی احتیاط اور پورے اعتدال سے کام نہ لیا جائے تو انسان کو نہایت سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے

اب میں بہت جلدی کسی کو دوست نہیں بناتا۔ نہ خود کسی کا دوست بنتا ہوں۔ اور دوست بنانے میں مجھکو مشاہدہ اور تجربہ سے مسلسل کام لینا پڑتا ہے۔ ملنساری کا برتاؤ اور چیز ہے اور دوستی کسی دوسری شے کو کہتے ہیں۔ دوستی ایک ناقابل ختم ملنساری ہے۔ اور جیسی زندگی کو اسکی سخت ضرورت ہے ویسی ہی مشکل سے وہ میسر آتی ہے۔

جس زمانہ میں خفیہ پولیس کی نگرانی مجھ پر تھی عجیب و غریب دوستوں سے سابقہ پیش آیا اور ان دوستوں سے چند روپے کی تنخواہ کے عوض مجھکو آزار پہنچائے۔ مگر اب میرے مشاہدہ کی اتنی قوت ہے کہ بناوٹی دوستوں کو آسانی سے پرکھ سکتا ہوں۔

ایکا ایکی محبت میں ٹوٹ پڑنے والا آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ کیوں اور کس غرض سے محبت جتاتا ہے۔ جو شخص اسپر غور کرے گا۔ اور اعتدال سے نہ بڑھے گا۔ تو محبت جتانے والے کے ضرر سے کوئی تکلیف اسکو نہ ہوگی۔

مشہور آدمی۔ یا پیر کی شخصیت جسکی ہو اسکو فوری محبت کے سمجھنے میں بہت مشکل ہوتی ہے کیونکہ ایسے لوگوں کے واقعی محب بھی کثرت سے ہوتے ہیں۔ اسکو تجربہ اور مشاہدہ کی قوت درکار ہے جس سے وہ کھرے کھوٹے کو پرکھ سکے۔

زیادہ خط و کتابت

مجھکو بچپن اور شروع زندگی میں لوگوں سے خط و کتابت کرنے کا بہت شوق تھا۔ اور خواہ مخواہ کے دوست اس مقصد کی تکمیل کے لئے پیدا کرتا تھا۔ اب یا تو کام کی کثرت یا قوت مشاہدہ و تجربہ کے بڑھ جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی غلطی تھی۔

صوفیوں نے کہا ہے تعلقات کا کم کرنا تصوف ہے۔ میں کہتا تھا تعلقات ہی کا نام زندگی ہے۔ اب کہتا ہوں صوفی سچے ہیں۔ تعلقات کی کمی تصوف ہی نہیں بلکہ دنیاداری کی زندگی ہے۔ جسکے تعلقات کم ہیں اسکی تکلیفیں اور ذمہ داریاں بھی کم ہیں۔

زیادہ میل جول والا دنیا کے مقاصد کو جلدی حاصل کر لیتا ہے۔ اور تعلقات ایک

ایسی طاقت رکھتے ہیں، جو نہ حکومت میں ہے نہ دولت میں ہے۔ مگر ان تعلقات کے برقرار رکھنے
میں جو روح کا جوہر اور بے تعلق زندگی کی راحت خرچ کرنی پڑتی ہے اس سے آدمی بالکل
ادھ مرا ہو جاتا ہے۔ اور وزن کرنے سے تعلقات کی طاقت بے تعلقی کی راحت سے بہت
ہلکی معلوم ہوتی ہے۔

اسیلئے میں نے کہا ہے۔ مردہ اچھا زندہ ہے کہ تعلقات نہیں رکھتا اور
زندہ برا مردہ ہے کہ تعلقات کی سکرات میں ہر وقت مبتلا رہتا ہے۔

اپنا کام اپنے ہاتھ سے

مشرقی غلامی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مشرقی
سلاطین و امرا اپنا کام اپنے ہاتھ سے نہیں کرتے۔
اور دوسروں پر ہر چیز کا حصر رکھتے ہیں۔ میں نے ابتدا سے آنحضرت صلعم کی سنت کا خیال کر کے
اپنے ہر کام کو اپنے ہی ہاتھ سے کیا۔ کیونکہ آنحضرت صلعم اپنے سب کام خود اپنے دست
مبارک سے کرتے تھے۔ اور باوجود غلاموں اور امت کے بے شمار خادم کے کسی پر اپنا بوجھ
نہ ڈالتے تھے۔

ذاتی تجربہ سے مشاہدہ ہوا کہ آپ کام مہا کام۔ کی مثل بالکل سچی ہے۔ میری ہر
کامیابی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ میں اپنے سب کام خود کرتا ہوں۔ اور جب تک دوسروں کے
کام پر خود ایک نظر نہ ڈال لوں، جو وہ میری ملازمت میں انجام دیتے ہیں مجھکو اطمینان نہیں ہوتا
میں عام پیروں کی طرح سفر میں مریدوں کو یا بڑے آدمیوں کی طرح نوکروں کو ساتھ نہیں کرتا
اور اگر گھر والے میری علالت یا کسی اور خطرہ کے خیال سے نوکر کو میرے ساتھ کر دیں تو خود
مجکو اس نوکر کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ مجھے اپنی ذات کی آسایش سے زیادہ اپنے
رفیق کا خیال رہتا ہے۔ نوکر صاحب کے پاس جا کر کھانا دیتا ہوں۔ پانی پہنچاتا ہوں اور
انکی اچھی اور آرام کی جگہ کا فکر ہر وقت بے چین رکھتا ہے کیونکہ میں سکنڈ یا فرسٹ کلاس
میں ہوتا ہوں اور وہ جناب تھرڈ میں ہوتے ہیں۔ اور تھرڈ کلاس جس قسم کی دوزخ ہے اسکو

سب جانتے ہیں۔

اپنا بچھونا سفر کے زمانہ میں خود بچھانا خود ٹھیک کرنا مجھکو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ البتہ گھر میں بیوی اور سفر میں بعض احباب و مریدین اصرار کرتے ہیں تو یہ حق انکو دیدیتا ہوں۔

مریدوں سے وضو کرانے کی مجھکو بالکل عادت نہیں ہے۔ اور جہاں کہیں ایسا پیش آئے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔

پاؤں دبوانے کی عادت البتہ مجھکو ہے۔ مگر اب اسکو بھی رفتہ رفتہ ترک کرتا ہوں۔

دوسروں کا کام کرنے میں جو لذت مجھکو آتی ہے وہ دوسروں سے اپنا کام کرانے میں نہیں آتی۔ خدمت کر کے مخدوم بننے کی حرص و ہوس مجھکو نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک طرح کی عادت و خصلت ہو گئی ہے۔ اور اسکا نتیجہ یہ ہے کہ میں ہر وقت مستعد رہتا ہوں۔ اور میرے کاموں میں بہت کم غلطیاں واقع ہوتی ہیں۔

تجارتی معاملات میں بھی دکانوں پر پھر کر اور چیز کا مقابلہ کر کے اور نرخ کی کمی بیشی سمجھکر خرید و فروخت کرتا ہوں۔ اور یہی وجہ ہے کہ واحدی صاحب و دیگر ہم پیشہ تاجروں سے مجھکو نفع زیادہ ہوتا ہے کیونکہ میں کاغذ کی خرید۔ لکھائی۔ چھپائی اور تمام جزئیات کی اپنی ذاتی نگرانی میں کرتا اور کراتا ہوں۔ اور وہ اسکی کم پروا کرتے ہیں بلکہ نوکروں پر دار و مدار رکھتے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ ایک انسان سب کاموں کو اپنے ہاتھ سے نہیں کر سکتا اور نہ تمام باتوں کی نگرانی ممکن ہو سکتی ہے۔ تاہم اس عادت سے آدمی کاہل اور دوسروں کا محتاج نہیں ہونے پاتا۔ اور ماتحت لوگ غفلت نہیں کر سکتے۔

ایکدفعہ رسالہ نظام المشائخ تیار تھا۔ اور ملازم موجود نہ تھا۔ جو ڈاکخانہ لیجاتا کوئی مزدور بھی نہ ملا۔ ڈاک کا وقت جا رہا تھا۔ میں نے خود وہ بہت بھاری بوجھ اٹھا لیا۔ اور واحدی صاحب کی مخالفت شدید کے باوجود خود سے جاکر ڈاکخانہ میں پہنچا دیا۔

میرا مشاہدہ ہے کہ جو دوسروں کو کاہل بنانا چاہتا ہے وہ ان کو زیادہ نعمت پہنچاتے

جاؤں کے سامنے خود کام کرنے لگے وہ سب کاہی بن جائینگے۔ میں نے بڑے بڑے کاہل و دیوانہ کام کو خلاف فیشن سمجھنے والے لوگوں کو دیکھا ہے کہ مجھکو خود کام کرتے دیکھکر وہ مجبوراً کام کرنے لگے۔ جس کام کو جلدی پورا کرانا ہو تو میں خود نوکروں کے ساتھ کام کرنے لگتا ہوں اور اپنی عملی تیزی اور پھرتی سے انہیں کام کی جان ڈال دیتا ہوں۔

سوائے شدید بیماریوں کے کوئی دن میری زندگی کا ایسا نہیں گزرا جب میں نے اپنی ذات کی یا دوسرے کسی کی وہ خدمت نہ کی ہو جو امیر اور بڑے لوگ صرف نوکروں سے کرایا کرتے ہیں۔ میں اپنی بیوی اور لڑکی کو تربیت کرنے کے لئے بعض اوقات گھر میں جھاڑو بھی دیدیتا ہوں۔ برتن بھی مانجھ لیتا ہوں۔ پانی کے مٹکے بھی صاف کر لیتا ہوں۔ بلکہ صبح کے وقت تھوڑا تھوڑا وقت ان کو گھر کی صفائی اور چیزوں کے سلیقہ سے رکھنے میں مشورہ دیتا ہوں۔ اس طرح کہ دوڑ دوڑ کر خود دو چار کام کئے۔ اور انکی مشین چلا دی۔ اسکے بعد وہ سب خود مصروف ہو جاتے ہیں۔ اور میں اپنا دوسرا کام لکھنے کا شروع کر دیتا ہوں۔

مجھے نکمے آدمیوں سے سخت نفرت ہی نہیں عداوت ہے۔ کیونکہ میں ان کو خدا کی زمین کا ایک بوجھ سمجھتا ہوں۔ میرا بس چلے تو انکو قتل کر ڈالوں۔ جو بیٹھے رہتے ہیں اور وقت بیکار کھوتے ہیں اور اپنا کام دوسروں سے کراتے ہیں۔

صفائی کی ناقابلیت

مجھ میں صاف رہنے۔ اور لکھنے پڑھنے کی جگہ کو صاف رکھنے کی مطلق صلاحیت نہیں ہے۔ حالانکہ میں بہت زیادہ اسکی کوشش کرتا ہوں۔ اس معاملہ میں واصدی صاحب کی صفائی ستھرائی پر مجھے رشک آتا ہے۔

میں نے اسکو بہت سوچا کہ باوجود خود کام کرنے اور ہر کام کا خیال رکھنے کے میری اس کمزوری کی درستی کیوں نہیں ہوتی۔ تو تجربہ نے مجھکو بتایا کہ ابتدائی تخم ریزی کا نقص ہے۔ اگر بچپن سے مجھکو چیزوں کے دھر رکھنے۔ اور مرتب کرنے کا سلیقہ سکھایا جاتا تو اب مجھکو

کچھ بھی محنت نہ کرنی پڑتی اور میں ایک عادت کی طرح اپنی چیزوں کو مرتب اور صاف رکھ سکتا۔

صفائی اور سلیقہ محنت سے نہیں آسکتا۔ اسکے لیے شروع سے تربیت ہونی چاہیے بلکہ میرا تو تجربہ یہ ہے کہ سلیقہ کے لیے دولت اور علم کی بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں نے بہت سے آدمیوں کو دیکھا ہے کہ ان کے پاس کثیر دولت بھی ہے۔ اچھا مکان بھی ہے۔ آرائش کا سامان بھی ہے۔ علم بھی ہے مگر سلیقہ نام کو نہیں۔ آرائش کی مکلف چیزیں گھر میں اس طرح بکھری پڑی رہتی ہیں جیسے کوڑا۔

اور بعض غریبوں کو دیکھا کہ نہ عمدہ مکان ہے۔ نہ سامان آرائش ہے۔ نہ وہ تعلیم یافتہ ہیں مگر انکا غریبانہ گھر ایسا صاف و مرتب نظر آتا ہے کہ اسکو دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ اول الذکر میں سلیقہ کی قابلیت نہیں ہوتی۔ اور آخر الذکر میں ابتدا سے سلیقہ ہوتا ہے۔ ترتیب کے ساتھ اگر کنکریوں کو اور پتھروں کو رکھ دیا جائے تو وہ بھی خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ اور موتی اور ہیرے بے قرینہ بکھیر دے جائیں تو جی چاہتا ہے کہ ان کو جھاڑو سے صاف کر کے پھینک دیا جائے۔

اس معاملہ میں نئی روشنی والوں کی تمیزداری مجھکو بہت پسند ہے کہ انکی ہر چیز صاف ستھری اور سلیقہ مند ہوتی ہے۔ میرا دل اندر سے صفائی اور سلیقہ کو ڈھونڈتا ہے میری آنکھیں تلاش کرتی ہیں کہ میں جہاں بیٹھا ہوں وہ ہر اعتبار سے مرتب اور صاف ہو۔ مگر وہ صفائی اور ترتیب سامنے نہیں آتی۔ کیونکہ اسکی طاقت میرے اندر بند ہو گئی ہے اور ابتدائی نقص نے اسکو باہر آنے سے روک دیا ہے۔ اور اسکے آنے کے دروازہ پر قفل لگ گیا ہے۔

میری بیوی ان سب عورتوں سے زیادہ تمیزدار اور باسلیقہ ہیں جن میں وہ پیدا ہوئیں۔ اور ہوش سنبھالا۔ مگر میری اندر کی تربیتی ہوئی اور بند خواہش صفائی و سلیقگی کو وہ بھی باہر نہیں لا سکیں کیونکہ انکی بھی ابتدائی تربیت ویسی ہی ہوئی ہے۔

یعنی میری ہوئی تھی۔

مجھ سے کہا جاتا ہے شاعر اور مضمون نگار اور خوار سیدہ لوگ ان ظاہری تکلفات کی طرف توجہ نہیں کیا کرتے۔ اور ان سب کی حالت ایسی ہی ہوتی ہے۔ مگر میرے دل میں اس بیان کو قبول کرنے کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اندر والی چیز اسکے خلاف دکھا دینے کا دعویٰ کرتی ہے اگر اسکو موقع ملے۔

اس مشاہدہ زندگی سے افسردہ ہو کر میں کہتا ہوں۔ دنیا میں کوئی شخص دولت اور اسباب دنیا کی ترقی نہ چاہے بلکہ یہ دعا مانگے کہ الٰہی مجھکو سلیقہ دے۔ کہ میں تیری تھوڑی سی نعمت کو بھی بہت سا کر کے دکھاؤں۔

اس تجربہ سے لوگوں کو راغب ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی اولاد کو یورپین سکولوں سے یا یورپین طرز کے جاننے والوں سے گھرداری کا سلیقہ تعلیم کرائیں۔ میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ ان کو یورپین بنا دو یا انکی طرح نمائش و آرائش میں فضول خرچی کرو۔ بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ ان کو اپنے جسم اپنے لباس۔ اور اپنے گھر کے سامان کا سلیقہ سے رکھنا اور صفائی سے برتنا سکھاؤ۔ کہ یہی زندگی کی اصلی راحت ہے۔

مجھکو تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ بے سلیقہ گھروں میں آرائش کا سامان لانا بڑی غلطی ہے۔ جب تک ان چیزوں کا گھر والوں کو برتنا نہ آتا ہو تو ان کو وہ چیزیں دینی اپنے روپے کا برباد کرنا ہے۔ اور دل کا خواہ مخواہ جلانا ہے۔

تجربہ نے سکھایا کہ اگر ہر چیز کا مرتب رکھنا منظور ہو تو جہاں سے کوئی چیز اٹھاؤ وہیں اسکو رکھدو۔ اور یہ خیال نہ کرو کہ پھر فرصت میں رکھدینگے۔ کیونکہ آئندہ کا خیال ہی انسان کے سلیقہ میں خلل ڈالتا ہے۔ جو کام کرنا ہو اسکو فوراً کرو۔ دوسرے وقت پر منحصر کرنا غلطی ہے۔ بائیں کوچہ تماشہ نے مجھے سکھایا کہ یورپ والے جب گھر میں آتے ہیں تو دروازہ میں جوتا اتار کے رکھتے ہیں جہاں تک دروازے پر ایک منٹ میں جا رکھ دیں بلکہ

باہر جانا آنا پڑے تو ہر دفعہ دروازہ بند کرینگے اور کھولیں گے یہ نہیں ہوگا کہ ابھی واپس آنا
ہے لاؤ دروازہ کھلا چھوڑ چلیں کیونکہ ابھی پھر کھولنا پڑے گا۔ وہ اسکی پروا نہیں کرتے وہ ہر
نقل و حرکت میں دروازہ ضرور بند کرتے ہیں۔ یہاں تک دیکھا کہ چور کسی گھر میں چوری کرنے
آتا ہے تو وہ بھی کمرہ کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ کیونکہ ان کو دروازہ کھلا رکھنے کا علم ہی نہیں
اور وہ اسکا بند کرنا ہی جانتے ہیں۔ اور ہم لوگوں میں یہ عادت ہے کہ ضروری اور قیمتی اسباب
کی کوٹھڑیاں اور الماریاں تک کھلی پڑی رہتی ہیں۔

ایکدفعہ جنگل میں کتے رو رہے تھے۔ ایک بوڑھے کتے نے پوچھا تم کیوں روتے ہو
انہوں نے کہا پھوہڑ عورت نے اپنے دروازہ کو بھی کواڑ چڑھوا لیے۔ اب ہم اسکے گھر میں
کھانے پینے کو کیونکر جائینگے کواڑ نہ تھے تو پھوہڑ عورت کے گھر سے ہمارا پیٹ پلتا تھا
بوڑھے کتے نے کہا۔ ارے دیوانو۔ جب وہ عورت پھوہڑ ہے اور انتظام کرنے کی اسکو
لیاقت نہیں تو کواڑ بند کون کرے گا۔ کواڑ بنتے ہیں تو بن جانے دو۔ وہ ہمیشہ کھلے پڑے
رہینگے۔ کہ سگھڑ عورت بغیر کواڑوں کے ہی گھر کو کتوں سے بچا سکتی ہے۔ اور پھوہڑ عورت
مضبوط قلعہ میں بھی کتوں کو آنے سے نہیں روک سکتی۔

نکمے اور کاہل نوکر میرے ہاں بعض کاہل اور نکمے نوکروں کو دیکھ کر دوستوں نے اعتراض
کیا کہ تم ایسے فضول آدمیوں کو کیوں نوکر رکھتے ہو جو کام نہیں کرتے
یا کام کرنے سے دم چراتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ایک کامل اور لائق آدمی کے نوکر رکھنے سے بیشک کام اچھا ہوتا ہے
مگر کسی کی اصلاح کا فرض ادا نہیں ہو سکتا۔ یہ بعض لوگ مجھکو کام کرتا دیکھ کر شاید کام کرنے
لگیں۔ اور انکی اصلاح ہو جائے تو ایک مردہ کو زندہ کرنے کا ثواب کماؤنگا۔

تجربہ کاروں نے ایک بزرگ کا لطیفہ بیان کیا کہ وہ ہندوستان کے کسی دریا کے کنارے وضو
کرتا تھا کہ ایک بچھو دریا میں ڈوب رہا ہے اور اسکے نکالنے کو دو تین بار ہاتھ بڑھایا

تو تم اسکو نکالو گے یا نہیں۔ تو ہر ہندوستانی جواب دیتا تھا کہ ہم ایسی بیوقوفی کبھی نہ کرینگے
کہ ایک اشرفی کے لئے دو اشرفیاں خرچ کریں۔ اور ایک کو زندہ کرنے میں دو کو مار دیں
مگر وہی جب یہی سوال اہل جرمن سے کرتا تو وہ جواب دیتے کہ دو اشرفیاں چھوڑ کر دو سو
اشرفیاں ایک اشرفی کو دریا سے نکالنے میں خرچ کر دینگے کیونکہ وہ دو سو اشرفیاں مردہ
نہیں ہونگی بلکہ ہمارے ملک والوں کے پاس رہ جائینگی جو اشرفی کو دریا سے نکالنے کی
محنت کرینگے۔ اس طرح ان دو سو اشرفیوں کی زندگی قائم رہے گی۔ اور ہمارا فرض ہے کہ اسکو
بیکاری سے نکال کر اپنے ملک کے کام میں لگائیں۔

پس اس بیانی واقعہ سے مجھکو عبرت ہوتی ہے اور میں اپنے مردہ بھائیوں کو زندہ
کرنا چاہتا ہوں۔ چاہے وہ میرا کام خراب کر دیں۔ یا اجرت کی موافق محنت نہ کریں۔ مگر ایک
مدت میں تو سیکھ ہی جائینگے۔ اگر میں نے ان کو جواب دیدیا تو کوئی انکی کام چوری اور سستی
کے سبب ان کو نوکر نہ رکھیگا اور یہ رہے سہے بھی ناکارہ ہو جائینگے۔ حکیموں نے کہا ہے
"بالکل کچھ نہ کرنے کے مقابلہ میں کچھ تھوڑا کر لینا بھی غنیمت ہے"

ہنسی خوشی کا ایک منٹ بھی قیمتی ہے

سنہ ۱۹۱۱ء میں پورٹ سعید سے بمبئی آرہا تھا راستہ میں طوفان آیا اور
افسران جہاز نے خطرہ کا اعلان کیا اور جان بچانے کی تدبیریں ہونی شروع ہوگئیں۔ میرے
قریب چند یہودی عورتیں بیٹھی تھیں۔ وہ چیخ چیخ کر رونے پیٹنے لگیں۔ مجھے ہنسی آگئی کیونکہ
ان کا رونا کچھ اسی قسم کا تھا۔ ایک عورت نے مجھکو ہنستا دیکھکر کہا کیا تم کو اپنے مرنے کی خبر
نہیں ہے جو ہنستے ہو۔ میں نے جواب دیا مجھے معلوم ہے کہ جہاز خطرہ میں ہے۔ مگر میں
ہنسکر مرنا چاہتا ہوں اور تم رو کر مرنا چاہتی ہو۔ مرنا دونوں کو پڑے گا۔

اس بے خوفی کا سبق مجھکو دمشق میں ملا تھا۔ میں نے ایک یہودی سردار کو ترکی پولیس
کے ہاتھ میں مقید دیکھا۔ وہ سردار بہت بشاش اور بے فکر معلوم ہوتا تھا۔ میں نے پولیس سے

پوچھا یہ کون ہے اور اس کا کیا جرم ہے۔ اس نے کہا یہ مشہور ڈاکو ہے اس نے ریل کی پٹری اکھاڑ دی تھی۔ اور ڈاکے بھی بہت مار چکا ہے۔ اب اس کو قتل کیا جائے گا۔ اب تو مجھے اور بھی تعجب ہوا کہ مرنے کو جاتا ہے اور خوش ہے۔ آخر پولیس کی اجازت سے میں نے بدو سے پوچھا کہ تم خوش معلوم ہوتے ہو شاید تم کو اپنے پھانسی پانے کی خبر نہیں ہے۔ بدو نے جھٹ جواب دیا مجھے معلوم ہے کہ کل دوپہر کو میں اس سامنے والے پل پر موت کی رسی میں لٹکایا جاؤں گا۔ مگر میں نے اپنے باپ سے سنا ہے کہ خوشی کی ایک ساعت ہزار سونوں سے خریدی جائے تب بھی سستی ہے۔ پھر میں کئی ساعت کی خوشی کو ایک موت کے ہاتھ کیوں فروخت کروں ؎

محبت رہتی یا وقعت گھٹتی

کہ میری عادت مریدوں اور دوستوں سے ظرافت اور خوش طبعی کرنے کی بہت ہے۔ کسی پیر کو میں نے مریدوں سے اتنا بے تکلف نہیں دیکھا جتنا میں اپنے مریدوں کے ساتھ ہوں۔ مرید ہی نہیں میں اپنے گھر والوں سے بھی ہر وقت ہنسی خوشی کی باتیں کرتا رہتا ہوں۔ اور یہ میری عادت ہو گئی ہے جسکو اگر بدلنا چاہوں تو بدل نہیں سکتا۔

تجربہ نے مجھکو بتایا کہ یہ عادت محبت بڑھاتی ہے۔ اور وقعت گھٹاتی ہے۔ جو تعلق میرے مریدوں کو مجھ سے ہے وہ بہت کم پیروں کو نصیب ہوتا ہے۔ ہر پیر کو سابقہ پیش آیا ہوگا کہ کچھ مرید اسکے بدعقیدہ و منکر ہو گئے۔ مگر مجھکو ایک مرید بھی ایسا نہیں ملا جس نے مرید ہو کر سرکشی کی ہو۔ یا بیعت سے مرتد ہو گیا ہو۔ اسکی وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ میں اپنے مریدوں سے دوستوں اور بہت بے تکلف دوستوں کا برتاؤ کرتا ہوں۔ اور وہ مجھ سے اپنے مخفی سے مخفی حالات اس طرح کہدیتے ہیں جو دوستوں کے سوا کسی سے نہیں کہے جاتے۔ اور انکو مجھ سے پیری مریدی کے تعلق کے ساتھ دوستانہ محبت بھی ہو جاتی ہے۔

مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ بعض اوقات یہ خوش طبعی میری وقعت کو نقصان پہنچاتی ہے

اور ان پر میرا وہ رعب قائم نہیں رہتا جو اطاعت کے فرض پورا کرنے میں ضروری پیدا کرتی ہو۔

میں نے اس پر بہت غور کیا ہے۔ اور مریدوں کی بہتری کے تقاضے نے مجھے تنبیہ کی ہے کہ میں انہی کی خاطر اپنی وقعت کا تحفظ ہی ملحوظ رکھا کروں۔ اور زیادہ خوش طبعی اور بے تکلفی سے دور رکھوں۔

مگر ایک تو میں اپنی عادت بدل نہیں سکتا جو اب پختہ ہو گئی ہے۔ دوسرے مجھے اپنی وقعت میں وہ لطف نہیں آتا جو اظہار محبت میں آتا ہے اور تیسرے محبت کی بے تکلفانہ اطاعت کو رعب کی مجبورانہ اطاعت سے میں بڑھا ہوا سمجھتا ہوں۔

یہ صرف میری ذات تک محدود ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ اسکو مجھ ہی تک محدود رہنا چاہیئے۔ ورنہ مشاہدہ یہ ہے کہ میں دوسروں کو اسکے خلاف نصیحت کروں۔ اور اصول کہ جسکو دنیا میں کچھ کام کرنا ہے اسکو ہر وقت کی ظرافت سے قطعی احتیاط کرنی چاہیئے۔

رسول خدا صلعم بھی (بلا تشبیہ) اپنے اصحابؓ سے خوش طبعی فرماتے تھے۔ اور ایسی محبت کرتے تھے کہ ان میں سے ہر شخص یہی خیال کرتا تھا کہ حضرتؐ مجھ سے زیادہ کسی سے تعلق نہیں رکھتے۔ پھر بھی رعب کا یہ حال تھا کہ صحابہ ادب سے سر جھکائے بیٹھے رہتے تھے جسکو انہوں نے خود کہا ہے کہ ہم ایسے بیٹھتے تھے گویا ہمارے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہیں کہ ذرا گردن ہلائیں گے تو وہ اڑ جائینگی۔ یہ رعب قوت نبوت کا تھا۔ اور مادی نظر سے دیکھا جائے تو آنحضرتؐ صحابہؓ سے ہر وقت بے تکلف نہ رہتے تھے۔ اور بعض اوقات ان پر خفگی کا اظہار بھی فرماتے تھے۔

تیوری چڑھانا اور ناراضی کا اظہار چہرہ سے کرنا۔ یا خفگی میں منہ پھیر لینا قرآن شریف سے ثابت ہے کہ آنحضرتؐ نے ایسا کیا۔ اور جب ایک دفعہ کیا تو اور موقعوں پر بھی ایسا کرتے ہونگے۔ گو قرآن میں جہاں کہیں ذکر ہے وہاں اسکی مخالفت کی گئی ہے کہ ایسا اخلاق لوگوں سے نہ برتو۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں۔ عَبَسَ وَتَوَلّٰى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى۔ تیوری چڑھائی

اور منہ پھیر لیا۔ اس سے کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا تھا۔ وَمَا اَدْرٰکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی۔ تمہیں کیا خبر شاید وہ (تمہاری صحبت سے) پاکیزہ ہو جاتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن خشک و کرخت برتاؤ کو پسند نہیں کرتا اور لوگوں کی ہدایت (پاکیزگی خیالات و عقائد) کو محبت کے برتاؤ میں سمجھتا ہے مگر یہ قرآن نے ایک خاص موقع کا ذکر کیا ہے اور سرکش بڑے درجہ کے آدمیوں سے غریب اور چھوٹے درجہ کے آدمیوں کو زیادہ توجہ کے قابل بتایا ہے۔ کیونکہ آنحضرتؐ نے عبداللہ ابن مکتوم نابینا صحابی کے دخل در معقولات سے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا تھا۔ اس وقت آپ چند کافر سرداران قریش کو نصیحت کر رہے تھے۔ ابن مکتوم کو اس کی خبر نہ تھی انہوں نے مجلس میں آتے ہی آپ کو پکارا کہ یا رسول اللہ فلاں بات کیونکر ہے۔ آپ کو ان کا بولنا ناگوار ہوا اور پیشانی مبارک پر شکن پڑ گئے۔ قرآن نے رسول خدا کو بھی ٹوک دیا کہ امیر کے مقابلہ میں غریب سے ایسا برتاؤ کیوں کیا۔ کہ غریب میں پاکیزہ صحبت کی امیر سے زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔

قیلولہ نہ کرنا

دوپہر کو کھانا کھا کر کچھ دیر سونا اور آرام کرنا قیلولہ کہلاتا ہے۔ آنحضرتؐ دوپہر کو قیلولہ ضرور کرتے تھے۔ اور یہ سنت ہے۔ مگر میں اس سنت پر بہت کم عمل کر سکتا ہوں۔ کیونکہ قیلولہ ان کو مناسب ہے جو تہجد کے وقت بیدار ہوتے ہوں یا رات کو زیادہ جاگ کر عبادت کرتے ہوں۔ میں رات بھر سوتا ہوں تو دن کو قیلولہ کرنے کی ضرورت مجھ کو نہیں ہے۔

میں نے سیاحت اور مسلمانوں کی زندگی کے مشاہدہ سے یہ سمجھا کہ ان کے زوال کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ دن کو بہت سوتے ہیں۔ امیر لوگوں پر تو خدا کا قہر ہے کہ وہ رات بھر حرام شغلوں میں جاگتے ہیں۔ اور دن بھر سوتے ہیں۔ مگر عام مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اس عالم غریبی کے زمانہ میں دن کے وقت سونے کا رواج نکالا ہے۔ تہجد پڑھنے والے اگر قیلولہ کریں بجا ہیں ورنہ دن کو سونا زہر قاتل ہے۔ اس سے کاہلی اور سستی پیدا ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے

لیکن یہ زمانہ ایسا کٹھن ہے کہ ان کو دن بھر مستعدی سے محنت کرکے روزی کمانی چاہیے ورنہ
افلاس ان کا ستیاناس کر دیگا۔ مفلسوں کو جنکے بال بچے بھی ہوں، بجز فرضی عبادات کی عبادت
کرنی جائز نہیں ہے۔ وہ رات بھر آرام سے سوئیں۔ اور دن بھر حلال روزی کمانے کیلئے
محنت کریں یہی ان کے نامۂ اعمال میں عبادت ہو کر درج کی جائے گی کہ حلال روزی اور بال
بچوں کا پالنا فرض کے بعد سب سے بڑی عبادت ہے۔

غریبوں کا فروغ

جیسا کہ میں نے جگہ جگہ لکھا ہے کہ دنی اور غریب آدمیوں کے ساتھ مجھے دلی
ہمدردی ہے اور میں ان کو فروغ و ترقی میں دیکھنے کی دل سے تمنا رکھتا ہوں
مگر تجربہ نے مجھ کو خبردار کیا ہے کہ پرانے غریب یعنی جو نسل در نسل سے مفلسی اور غربت میں بسر کرتے
آئے ہوں ان کو ایک دفعہ ہی اعلیٰ درجہ پر لے آنا خطرناک غلطی ہے۔ وہ اعلیٰ حالت میں آکر فرعون
بن جاتے ہیں اور امیروں سے بہت زیادہ خرابیاں انہیں ہو جاتی ہیں۔ وہ محنت سے
بھاگتے ہیں۔ وہ کام سے دم چراتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو تیس مار خاں سمجھنے لگتے ہیں۔

ادنے اقوام میں جو لوگ عیسائی ہو گئے ہیں انمیں جنکو اعلیٰ تعلیم نہیں ملی سب ہی ان
نمائش کے دیکھے گئے کہ حد سے زیادہ شرابی۔ حد سے زیادہ نکمے۔ حد سے زیادہ مغرور۔
اور حد سے بڑھ کر ظالم۔

یورپ میں سوشلزم اور بالشویک تحریک کا غلغلہ مچا ہے۔ اسکا اثر تمام دنیا پر پڑیگا
کیونکہ دنیا امیروں کے مظالم اور خودغرضیوں سے عاجز ہو گئی ہے۔ اگر ہندوستان میں
یہ اثر پیدا ہو تو میرے اس مشاہدہ کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ کہ ادنے اقوام کو یکدم اعلیٰ
درجہ پر ہرگز نہ لایا جاوے۔ بلکہ رفتہ رفتہ درجہ بدرجہ ان کو بڑھانا مناسب ہوگا۔ پہلی بنیاد
تعلیم کی ترقی ہے۔ اور ہر اقوام کے حسب مزاج پیشوں اور محنتوں کا رواج دینا ہے۔ مثلاً
نائی کو موچی بنا دو حقہ داری کے تابع ہرگز نہیں ہیں دھوبی کو تعلیم یافتہ دھوبی رکھو یا گھاٹ کا
اور ہر نائی ہسپتال کمیٹی کا ہنرمند اسکو نوکر رکھ دینا چاہیئے۔

انہی کے پاس جاتا ہوں جن میں یہ بری خصلتیں نہ ہوں۔ اور اگر کوئی بری بات ان پیروں میں دیکھتا ہوں تو نرمی یا دوست نوشی سے اسکو رد کرتا ہوں۔ کیونکہ میں ان پیروں کا محتاج نہیں ہوں۔ میری معاش ذاتی محنت پر منحصر ہے۔

سفارش

شفاعت کا ایک حصہ سفارش ہے۔ گذشتہ زمانے کے فقرا بیکسوں مظلوموں اور حاجتمندوں کی سفارش بھی کیا کرتے تھے۔ مگر بزرگوں کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سفارش کرنے میں کبھی مبالغہ نہ کرتے تھے

میری ہمیشہ ابتدا سے یہ عادت ہے کہ میں سفارش چاہنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ اور تحریر و تقریر کے ذریعے سے انکی مدد کرتا ہوں۔ مگر تجربہ مجھکو یہ ہوا ہے کہ سفارش اہل مشرق خصوصاً مسلمانوں کو تباہ کرنے والی چیز ہے۔ دیسی ریاستوں میں "سازش اور سفارش" کے دو جن اور دو شیطان رات دن کام کرتے ہیں۔ سفارش نالائقوں کو بڑھاتی ہے۔ اور لائقوں کو برباد کرتی ہے۔ کیونکہ نااہل اور ناقابل لوگ سفارش کے زور سے لیاقت اور استحقاق غصب کر لیتے ہیں

میں تسلیم کرتا ہوں کہ سفارش بعض موقعوں پر مظلوموں کا حق بچا لیتی ہے یا بیکسوں کی مراد مند کر دیتی ہے مگر میرا دعویٰ ہے کہ زیادہ تر سفارش سے نقصان ہوتا ہے۔ مسلمان لیاقت حاصل نہیں کرتے صرف میل جول کی عادت ڈالتے ہیں تاکہ سفارش کی دولت حاصل ہو سکے۔ سفارش نے محنت و لیاقت کی صفات کو گھن لگا دیا ہے اور مسلمان اسکے سبب سے ان مناسبتوں میں گر گئے ہیں۔ مجھکو غیبی اشارات نے بتایا کہ سفارش توکل علی اللہ اور اپنی ذات کے اعتماد کی دشمن ہے اس سے مسلمانوں کو بچنا چاہئے۔ اسواسطے اب میں بہت احتیاط و غور کے بعد سفارش کرتا ہوں اور اس بری عادت کو مسلمانوں سے دور کرنے کی سعی میں مصروف ہوں۔ یہ بلا مرض ہے

میں سمجھتا ہوں جب ریاستوں کے بعض لوگ مرید ہوتے ہیں تو ان کے مرید ہونے کی وجہ کیا ہے۔ کیونکہ انمیں سے بعض لوگ محض سفارش حاصل کرنے کو مرید ہوتے ہیں۔

قیافہ شناسی

ایک فن ہے جسکی مدد سے انسان دوسرے آدمی کی نیت، عادت، خصلت پہچان لیتا ہے مجھکو اسکا بچپن سے شوق تھا۔ اسکی متعلق جتنی کتابیں تھیں پڑھیں۔ اور رات دن تجربہ بھی کئے۔ میں اکثر جیل خانوں کی سیر کرنے محض اس وجہ سے گیا کہ مجرموں کی صورتوں کا تجربہ حاصل کر کے قیافہ شناسی کو مکمل کروں۔ پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ غصہ، غم، خوشی، خوف، طمع کے اوقات میں ہر آدمی کا چہرہ معمولی نظر سے دل کی بات بتا دیتا ہے۔ چہرے کے اعصاب کو اللہ نے ایک قدرتی آئینہ بنایا ہے جسکو دیکھ کر آدمی آن کی آن میں اسکے دل کی بات

بتا سکتا ہوں میں ایک نظر ڈالتے ہی انسان کے ارادہ اور اس وقت کے خیالات کو سمجھ جاتا ہوں۔ دوستی اور دشمنی کے خیال کا حال ملاقات کی صورت ایک سکنڈ میں مجھ سے کہہ دیتی ہے۔ بعض اوقات تجربہ اور مشاہدہ کی قوت سے میں انسان کے گزرے ہوئے حالات بیان کرتا چلا جاتا ہوں اور وہ عموماً سب درست ہوتے ہیں۔ اسکو میرا مکاشفہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ غلط ہے میں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ مکاشفہ فقیری کا کمال نہیں ہے اور میرا یہ کمال محض قیافہ پہچاننے پر منحصر ہے۔

مکاشفہ

اس موقع پر یہ بھی لکھنا ضروری ہے کہ جس شخص کے خیالات پراگندہ نہوں اور اشغال سے جس نے اپنی قوت خیالی کو جمع کر لیا ہو تو اسکو دوسرے کے اور اپنے حالات کا کشف ہونے لگتا ہے اور وہ کسی غیر معمولی طریقہ سے نہیں بلکہ بالکل معمولی طور پر ذہن میں دوسرے کے حالات ایک عکس مشاہدہ کرتا ہے اور جب اس عکس کو زبان پر لاتا ہے تو وہ ہو بہو دوسرے آدمی کی حالت معلوم ہوتی ہے مگر خیال کی قوت ہر وقت جمع نہیں رہتی اسواسطے مکاشفہ بھی ہر وقت نہیں ہو سکتا۔ قیافہ شناسی ہر وقت ممکن ہے مگر مکاشفہ ممکن نہیں جیسے کہ مجذوبوں اور فقیروں کے حالات مکاشفہ مذکور سے معلوم ہو جاتے ہیں۔ تنہا مکانوں کو دیکھ کر بتا دیتا ہوں کہ اندر کون کون رہتا ہے لیکن یہ ہر وقت نہیں ہو سکتا نہ یہ اپنے اختیار کی چیز ہے کیونکہ جمعیت خیال کے اجتماع پر اسکا انحصار ہے وہ ذاتی اختیار کی شے نہیں ہے۔

عادت ایک طاقت ہے

میں نے اپنی زندگی کے بہت سے واقعات پر غور کرنے سے سمجھا ہے کہ عادت ایک بڑی طاقت ہے۔ دنیا میں تکلیف عادت کے سبب سے ہوا کرتی ہے

کم کھانا یا زیادہ کھانا عادت پر منحصر ہے کھانے کو جتنا بڑھاؤ بڑھ جائے گا جتنا گھٹاؤ گھٹ جائیگا۔ سونا عادت ہے جتنا زیادہ سونے کی عادت ڈالو سستی بڑھے گی اور جس قدر کم سونے میں کمی کرو گے نیند کم ہو جائیگی اور تم کو معلوم بھی نہ ہوگا۔ ڈاکٹر صاحبان آٹھ گھنٹہ کا سونا ضروری سمجھتے ہیں۔ میں نے صرف دو گھنٹہ رات دن میں سو کر وقت دیکھا ہے جس میں صحت بھی ٹھیک رہی یہ عادت نے کیا فطرت نے جو ہر شخص میں رکھی ہے اسکو زیادتی یا کمی سے تعلق نہیں ہے

گرمی سردی کی عادت تعلق رکھتا ہے ایک دن شخص پیدل چلنے کا عادی ہو جائے کوس پیدل چلا جاتا ہے دوسرا آدمی جسکو عادت نہیں ہے چار قدم بھی نہیں چل سکتا ایک آدمی پانچ سیر کا بوجھ جب اٹھا سکتا ہے

میں گزارہ کر لیتا ہے۔ مجھکو اس فلسفہ کا علم ہوا تو میں نے جفاکشی کی عادت کو آرام طلبی کی عادت پر ترجیح دی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مشقت۔ اور معمولی کی تندرستی اور دنیا کے حوادث مجھکو تکلیف نہیں دیتے۔ اگر راحت خدا دیتا ہے تو اسکی خوشی دگنی ہوتی ہے۔ اور تکلیف پیش آتی ہو تو عادت کے سبب اسکا اثر زیادہ محسوس نہیں ہوتا۔

توقع سے رنج و راحت

مجھکو زندگی نے بار بار سبق دیا کہ توقع کی بلند و پستی سے دنیا میں رنج و راحت پیدا ہوتے ہیں۔ میں جہاں سے دس روپے حاصل ہونے کی توقع کرتا تھا۔ اور خلاف توقع پانچ کم سو ملتے تھے تو قدرتی طور پر مجھکو رنج ہوتا تھا۔ حالانکہ آٹھ ہی ملنے کی توقع کرتا۔ تو یہی وہ مجھکو خوش کر دیتے۔ قناعت توقع کی مرشد ہے۔ اگر آدمی قناعت سے توقع کو پابند کر دیا کرے اور توقع کو زیادہ بلند نہ ہونے دے تو اسکو دنیا کی کسی چیز سے تکلیف نہ ہوگی۔

مزا مشکل کے اندر ہے

حضرت بابا گنج شکرؒ کے مزار مبارک پر پاکپٹن شریف میں بارہا حاضر ہوا ہوں مگر ہمیشہ سواری مل گیا۔ مگر ایک دفعہ پانچ کوس پیدل چلکر حاضری دی تو دل میں وہ لذت تھی۔ اور مزار ایسا پر انوار اور فیض برسانے والا معلوم ہوتا تھا کہ پہلے کبھی یہ بات میسر نہ آئی تھی۔ میں نے سمجھا کہ مزا مشکل کے اندر ہے۔

گرمی کا مشکل روزہ افطار کرکے۔ سردی کے موسم کی پچھلی رات کی نماز پڑھکر۔ اور بہت شدید مصائب کے بعد مجھکو جو خوشی ہوتی ہے وہ اسکی دلیل ہے کہ مزا مشکل میں ہے۔ اہل اللہ ہوئے مجھکو مشکل پسند مشکل پرست اور مشکلوں میں رہنے والا بنا دیا ہے۔

بے محنت کی دولت

میں نے مدینہ شریف۔ بیت المقدس۔ اجمیر شریف۔ اور خود اپنی درگاہ میں دیکھا کہ جن لوگوں کو بطور نذر کے مفت کی دولت ملتی ہے ان کو اسکی لذت نہیں آتی۔ اور وہ مفت کا رس نہیں ہوتا جو ایک نوکری کرنے والا مزدور چار آنہ حاصل کرکے مزا پاتا ہے۔ میں نے سمجھا محنت سے چار پیسے میں وہ لذت ہے جو مفت کے چار سو روپے میں نہیں۔ اگر دولت مفت کی ملے تو اسکے لئے کمائی جیسی محنت کرنی چاہیے۔

اولاد کا ورثہ

ہر جگہ تجربہ ہوا کہ باپ دادا نے محنت کرکے پیسہ پیسہ جمع کیا ہو اور اولاد اسکو بے دردی سے اڑا رہی ہیں۔ اس تجربے نے مجھکو نصیحت کی کہ اولاد کے لیے سب سے اچھا ورثہ تعلیم ہے۔

قرابت موت کے بعد ختم جن لوگوں کو اپنے بیوی بچوں کی فکر رہتا ہے کہ مرنے کے بعد انکی کیا حالت ہوگی وہ خدا کے انتظام کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ اور خدا کی سرپرستی پر نکتہ چینی اور حملہ کا جرم ان سے سرزد ہوتا ہے۔ یہ رشتے اور قرابت داریاں زندگی کے فرائض ہیں۔ مرنے کے بعد وہ ختم ہو جاتے ہیں اور خدا کی ذمہ داری میں آجاتے ہیں۔ آدمی کو اسکا فکر فضول ہے۔ یہ مجھکو باطن سے حکیم نے بتایا۔

دشمن بڑا دوست ہے میں نے دشمنوں کے ہجوم میں زندگی گذاری ہے اسلئے میں کہتا ہوں کہ دشمنی سے بڑھکر دنیا میں کوئی دوست نہیں ہے کیونکہ اسکے سبب آدمی ہوشیار رہتا اور بدی سے بچتا اور نیک بننا چاہتا ہے۔ دشمن ہی اسکو ترقی کا جوش دلاتا ہے۔ دشمن ہی اسکی زندگی میں جان ڈالتا ہے۔

دشمن کو مات کرنے کی چال جب دشمنوں نے مجھپر نئے سرے سے حملے شروع کئے تو میں نے ان پر وار کرنے کی کوشش نہ کی بلکہ اپنے کاموں کو زیادہ زور شور سے کرنے لگا۔ جس سے دشمنوں کا حسد بڑھتا اور حسد سے دشمنی بڑھتی تھی۔ اسوقت مجھے معلوم ہوا کہ دشمنوں کو زک دینے کی بہترین چال یہی ہے کہ جس چیز سے دشمنی پیدا ہوئی ہے اسکو ترقی دینی چاہیے جس سے دشمن جل جلکر کباب ہونگے۔ اگر میں ان کو جواب دینے یا ان پر وار کرنے کا ارادہ کرتا تو وہ کام رک جاتا جس سے ان کو حسد اور دشمنی تھی۔ اور میں گھاٹے میں رہتا اور دشمن نفع میں۔ خواہ میں ان کو کتنا ہی نقصان پہنچا دیتا۔ اب میں خدا کے سامنے منت میں سرخرو ہوں کہ میں نے مقابلہ کی بجائے اپنے کام کی ترقی سے دشمن کو مغلوب کرلیا۔ یعنی محض میرے کام کا فروغ ہی ان پر غلبہ پاتا تھا۔

سادے پانی کا لطف بنفشی پانی سوڈا لیمونیڈ وغیرہ سب پیکر دیکھ لیے جو مزا سادے پانی میں ہے وہ کسی پانی میں نہیں اسی طرح جو لطف بے تکلف اور سادہ زندگی میں آتا ہے بناوٹ اور تکلف کی زندگی میں نہیں آتا۔ اسی واسطے مجھکو سادہ پانی اور سادہ زندگی پسند ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا مزا ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا دنیا میں سب سے زیادہ مزہ کس چیز میں ہے میں نے کہا۔ کام میں۔ کام کرنے کے بعد جو سرور و نشہ اور مزا حاصل ہوتا ہے وہ کسی شہنشاہ کو بڑا ملک فتح کرنے کے بعد بھی نہ آتا ہوگا۔

میرا اچھوتا کھانا جن لوگوں کو بھونی چیز کھانے سے پرہیز ہے انکو اطلاع دیتا ہوں کہ

میری ہر تحریر میرا ضبط کیا ہوا ہوتی ہے کہ اسکو لکھ کر اصلی ذائقہ میں چکھ لیتا ہوں اور پھر تا دوسروں کے حصے میں آتا ہے۔ دنیا میں ہر مصنف کا یہی حال ہے کہ لطف تو وہ خود اٹھاتا ہے اور بچی کچھی تلچھٹ دوسروں کو تقسیم کرتا ہے

الحمد للہ کہنے کا وقت

چھینک آنے کے وقت زندگی میں ہزاروں مرتبہ الحمد للہ کہا ہوگا مگر مجھے اس الحمد للہ میں مزا نہیں آتا۔ تیز پیاس میں پانی کا گھونٹ پی کر اور سخت بھوک میں روٹی کا نوالہ کھا کر۔ اور شدید گرمی میں ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا پا کر جس اصلی خوشی سے الحمد للہ زبان پر آتی ہے وہ میری زندگی کا بے مثال مشاہدہ ہے۔

آنسو تزکیہ باطن کی بھٹی

باطن کی اصلاح اور دل میں گداز پیدا کرنے کے لیے میں نے کوئی عمل اور کوئی وظیفہ اتنا موثر نہیں پایا جتنے آنسو ہیں۔ رونا انسان کا زنگ دور کرنے کی بھٹی ہے آگ لوہے کے زنگ کو دور کرتی ہے اور آنسو آدمی کی کدورت صاف کرتے ہیں۔ جو قومیں رونے پر ہنستی ہیں وہ ناکامیاں اپنے ہنسنے پر روتی ہیں۔

آپ بیتی لکھنی عرفان النفس کا لکھنا

میں نے جب کبھی اپنی زندگی کا روزنامچہ لکھا تو محسوس ہوا گویا اپنی ہستی کے عرفان کا بہی کھاتہ لکھ رہا ہوں کہ جب اسکو دیکھتا ہوں آمد و خرچ کا حساب یاد آجاتا ہے۔ پس یہ آپ بیتی کی نوشت بھی مجھکو آگے چلکر اگر میں زندہ رہا زندگی کا حساب بتائے گی۔ ناظرین کیسا ہی سمجھیں میں نے تو کتاب لکھ کر عرفان نفس کا دروازہ کھلوایا ہے۔

جسم کو بھی خبر نہیں۔ روح جہاں چاہے کیسی ہی حالت دنیا کی جسم پر آجائے روح کو خبر نہیں ہوتی۔ اسکے علاوہ اگر خواب کی سیر روح کے حواس سے تعلق رکھتی ہوتی تو انسان بیداری کے خیالات کی طرح خواب کے خیالات پر بھی قابو رکھتا بیداری میں وہ جس طرف چاہتا ہے خیالات کو لیجاتا ہے۔ مگر نیند میں اسکو یہ اختیار نہیں ہوتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خواب میں اسکا چلنا پھرنا اور بولنا نہ جسم سے تعلق رکھتا ہے نہ روح سے۔ نہ دونوں کے مجموعہ سے۔ بلکہ وہ جوہر اصلی کی ایک شان ہے۔ اور اسی میں جو وہی جوہر اصلی جوہر کی ایک جھلک کا نام ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ خواب نبوت کا ایک حصہ ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خواب کی دنیا جسم و روح سے کچھ تعلق نہیں رکھتی بلکہ وہ جوہر اصلی کا جلوہ ہے۔

قرآن نے بشریت اور نبوت کا امتیاز بیان کرنے میں کہا ہے کہ محمد بھی ایک بشر ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان پر وحی آتی ہے۔ اب خیال کیا جائے کہ بشریت جسم و روح کے اتحاد سے قائم ہوتی ہے۔ اگر نبوت جسم و روح کے تعلق کی کوئی چیز ہوتی تو بشریت سے اسکو ممتاز نہ کیا جاتا۔ پس جس طرح نبوت جوہر اصلی عالم کا ایک پیغام ہے۔ اور جسم و روح سے الگ ہے اسی طرح خواب کی سیر بھی جسم و روح سے برتر اور جوہر اصلی کی وجہ ہے۔ اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ وہ نہ جسم ہے۔ نہ روح ہے نہ مجموعہ روح و جسم ہے۔

روح کوئی بڑی چیز نہیں ہے

آجکل یہ خیال بڑھ گیا ہے کہ روح سب سے بڑی چیز ہے۔ مگر جن بزرگوں نے روح کی فوقیت بیان کی ہے انکی مراد روح سے وہ روح نہیں ہے جو جسم کو زندہ رکھتی ہے اور وہ اسی جسم کا طفیل ہے۔ بلکہ وہ اسی جوہر اصلی کو روح کہتے اور سمجھتے ہیں جسم کی کفالت کرنے والی روح ایک ادنیٰ شے ہے۔ جوہر اصلی کی چمک اسپر پڑتی ہے تو وہ بھی کچھ منور ہو جاتی ہے۔ ورنہ اسکو اپنے بدن کی خبر گیری کے سوا اور کسی بات کی خبر نہیں ہوتی۔ اور بدن سے جدا ہو جانے کے بعد اسکا کچھ بھی وجود باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ وہ قدرت الٰہی کا ایک ہاتھ ہے جو انسان کے جسم کی ترکیب میں پیدا کی جاتی ہے۔ اور حرکت کی شکل میں ہر وقت جنبش کرتی رہتی ہے۔

ہر وجود کا مثل جوہر وجود جاری بنائی ہوئی داستان کے اندر ایک ہی میں موجود ہے کسی وجود کا جسم تن کے مجموعہ کو نقشہ سے کیا کم نہیں تھا۔ اگر یہ جوہر وجود کو دیکھتا اور کہتا ہے جیسا کہ سب انسان اپنے

غفرت عبدی بشفاعت حبیبی و رسولی

بخشدیا اپنے بندہ کو اپنے محبوب و رسول کی سفارش سے۔ ندامت کا پسینہ خشک ہو گا خوف کی خشکی تر ہو گی۔ غضب کا لرزہ رحم و فضل کی تسلی ٹھیریگی۔ اور جنت کے دربان رضوان کی آواز آئیگی

تعال تعال یا عبد اللہ

ادھر آ۔ ادھر آ۔ خدا کے بندے۔ میں دوڑونگا۔ مگر پھر الٹا پھرونگا اور کہونگا۔ میری میرے والدین میرے استاد میرے احباب میرے مرید عورت مرد نیک و بد سب کے سب جو منسوب عالی سے ہیں برکت شفاعت کبری نجات دلوایئے کہ بغیر ان کے جنت مجھکو دوزخ ہے۔

مجھکو حضور کے دامن کا پھر واسطہ آئے گی۔ ہاتھ اٹھائے جائینگے۔ ربنا یا ربنا کی صدا پھر بلند ہوگی۔ اور پھر سے مطالبات ایک ایک کر کے پیش کیے جائینگے۔ پھر رحمت جوش مارے گی۔ پھر فضل کے دریا میں موج اٹھے گی۔ اور ارشاد ہوگا۔ جانے دو۔ سب کو بہشت میں جانے دو خطائیں معاف کیں۔ جرائم سے در گذر ہوئی۔ یہ سنکر الحمد للہ رحیم الراحمین کا نعرہ لگاؤنگا۔ اور قطار در قطار ہمراہیوں کو لیئے ہوئے جنت میں چلا جاؤنگا۔ اور وہ وہی جگہ ہے جس کی طلب عالم ناسوت میں یہ الفاظ کرتے ہیں۔ اور عالم لاہوت میں وہ مقام ہے جسکو قرب کہا گیا ہے۔ وصل نام دیا گیا ہے۔ اور فنا فی الذات بھی کہکر کہنے والے لکھنے والے چپ ہو جایا کرتے ہیں ۔

KBOPL
U92 H28A
HL8067

حضرت خواجہ صاحب کی تیار کتابیں

اِس کتاب میں حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے اپنی جن تصنیفات کی فہرست دی ہے اُن میں ان کتابوں کا ذکر نہیں آیا جو بعد میں تیار ہوئی ہیں۔ جن حضرات کو ضرورت ہو مجھے طلب فرمالیں۔

طمانچہ بر رخسار یزید

یزید، ابن زیاد، شمر وغیرہ کے مخفی شرمناک حالات قصہ کے پیرائے میں لکھے گئے ہیں۔ اور قیمت صرف ایک روپیہ مقرر کی ہے۔

غدر دہلی حصہ سوئم

المعروف بہ محاصرۂ غدر دہلی کے خطوط جنکو انگریزی سے سلیس اردو میں ترجمہ کرایا گیا ہے قیمت صرف چار آنے ہے۔

جو کتابیں تیار ہو رہی ہیں

بہادر شاہ کا مقدمہ

غدر دہلی کے افسانوں کا چوتھا حصہ نہایت دلچسپ تاریخی کتاب ہے۔ دو ماہ میں شائع ہوگا

غدر دہلی کے خطوط

اس کتاب میں وہ خطوط ہیں جو بہادر شاہ سابق شہنشاہ دہلی کو ایام غدر میں لکھے گئے یا خود بہادر شاہ نے دوسروں کو لکھے اور

کی گرفتاری

جو سرکار انگریزی نے گرفتار کیے۔ نہایت پوشیدہ تاریخی خطوط ہیں۔ اور ہر خط دلچسپی سے لبریز۔ یہ کتاب بھی چھپ رہی ہے

کارکن حلقۃ المشائخ دہلی سے طلب کیجیے

جگ بیتی

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کی لکھی ہوئی کہانیاں جنکے مجموعہ کا نام جگ بیتی ہے
بہت مقبول اور موثر ہیں۔ چھوٹے بڑے بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ قیمت ۶ر

رسول بیتی

حضرت خواجہ صاحب کا لکھا ہوا میلاد نامہ رسول بیتی کے نام سے مشہور ہے اسقدر
پسند کیا گیا ہے کہ پانچ دفعہ چھپ چکا ہے۔ مولود شریف کی مجلسوں میں اب عموماً
یہی پڑھا جاتا ہے۔ قیمت غیر مجلد ۸ر۔ مجلد ۱۲ر۔

کرشن بیتی

حضرت خواجہ صاحب نے اس کتاب میں سری کرشن جی کے سوانح عمری کو
نہایت عمدگی سے مرتب کیا ہے۔
ریاست میسور کے محکمہ تعلیم میں داخل ہے۔ بالتصویر ہے۔ دو دفعہ چھپ
چکی ہے۔ قیمت غیر مجلد ۱۲ر مجلد ۱عہ

یہ سب کتابیں

کارکن حلقۃ المشائخ عرب سرائے دہلی سے منگائیے